Rs.30/-

جولائی ۲۰۲۱ء

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ

حیاتِ نو

دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Anjuman Talaba-e-Qadeem Jamiatul Falah

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

Ref No. .... Date 15-05-2021

محترم فلاحی برادران!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان "حیاتِ نو" آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اس کا معیار بلند کرنے، تسلسل کے ساتھ اس کی اشاعت ممکن بنانے اور اسے خود کفیل بنانے کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

۱۔ اللہ کا شکر ہے کہ فلاحی برادران میں اچھے قلم کاروں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ حیاتِ نو کو مسلسل ان کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح اپنے تعاون سے نوازتے رہیں گے۔ چونکہ حیاتِ نو تمام فلاحی برادران کا ترجمان ہے، اس لیے وہ ساتھی جو اپنے خیالات کو تحریری شکل دینا چاہتے ہیں، حیاتِ نو ان کی تخلیقات کا منتظر ہے۔ آپ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر حیاتِ نو کے ای میل (jareedahayatenau@gmail.com) پر ارسال کریں۔ ان شاء اللہ آپ کی تحریروں کو حسب ضرورت نوک پلک درست کرکے شاملِ اشاعت کیا جائے گا۔

۲۔ حیاتِ نو شدید خسارے میں چل رہا ہے۔ آپ خود بھی سالانہ خریدار بنیں اور دیگر فلاحی برادران اور اپنے حلقۂ احباب کو بھی اس جانب متوجہ کریں۔ ہر فلاحی تک حیاتِ نو کو پہنچانا ہمارا ہدف ہے۔ فلاحی برادران کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے۔ اگر ہر فلاحی حیاتِ نو کا خریدار بن جائے تو رسالہ خسارے سے نکل کر منافع بخش ہو جائے گا۔ حیاتِ نو کو ڈاک کے نظام کے تحت لانے کی کوشش جاری ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو مسلسل اور وقت پر رسالہ موصول ہوتا رہے گا۔

۳۔ انجمن کا اپنا بینک اکاؤنٹ اب تک نہیں کھل سکا ہے، کوشش جاری ہے۔ فی الحال درج ذیل اکاؤنٹ انجمن کے کاموں کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اس میں اپنا زرتعاون ارسال کرکے منیجر حیاتِ نو حافظ عطاء الرحمٰن کو واٹس اپ (9695398575) کے ذریعے مطلع کر دیں۔ ان شاء اللہ بذریعہ واٹس اپ رسید آپ کو بھیج دی جائے گی۔ (زرتعاون: فی شمارہ: ۳۰ روپے، سالانہ: ۳۰۰ روپے، لائف ممبرشپ: ۵۰۰۰ روپے)

امید ہے ان گزارشات پر توجہ دیں گے۔ آپ کے نیک مشوروں اور حسنِ تعاون کا انتظار اور استقبال ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

والسلام

عبید اللہ طاہر فلاحی

(سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح)

Account Holder: Obaidullah Tahir
Account Number: 50100419576986
IFSC Code: HDFC0003729
Branch: Shahabuddinpur
HDFC Bank

Anjuman Talba-e-Qadeem Jamiat-ul-Falah Bilariyaganj, Azamgarh

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو دہلی

مدیر مسئول : سید راشد حامدی
مدیر اعزازی : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مدیر معاون : محمد اسعد فلاحی
منیجر: عطاء الرحمٰن

جلد۔٦ ، شمارہ ۔ ۷ | جولائی ۲۰۲۱ء | ذی قعدہ ۱۴۴۲ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518،8287025094 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 9695398575

ای میل: jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰/روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔ مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، لندن
۲۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، علی گڑھ
۳۔ مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی
۴۔ مولانا عبد البر اثری فلاحی، ممبئی
۵۔ مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح
٦۔ امتیاز وحید فلاحی، کولکاتا
۷۔ محمد انس فلاحی مدنی، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

ہمارے نمائندے

۱۔ رضوان احمد فلاحی، لندن
۲۔ موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات
۳۔ حسن حبیب فلاحی، نیپال
۴۔ فیاض احمد فلاحی، قطر
۵۔ محمد سموئیل فلاحی، کویت
٦۔ ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب
۷۔ ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

اداریہ	ضیاءالدین ملک فلاحی	۴
قرآنیات		
افاداتِ جلیل احسن ندویؒ (قسط۔۱۹)	ظفراحمدالاثری	۹
سیر و سوانح		
حضرت عیسیٰؑ۔اسلامی تعلیمات کے تناظر میں (۲)	رضوان الحق فلاحی	۲۵
مولانا عبدالسلام ندوی۔ چند معروضات	عبداللہ زکریا	۳۷
یادِ رفتگاں		
اداس کیوں ہے آخر مرا مینارِ فلاح	رضوان احمد فلاحی	۴۶
تجھ سا کہیں کسے: آہ! ڈاکٹر غفران احمد	محمد سمیع اختر فلاحی	۵۲
شہیدِ کورونا۔ ماموں جان: پروفیسر اشتیاق دانش	محمد ارشد	۶۳
طب یونانی کا روشن ستارہ۔غروب ہوگیا	شمشاد عالم	۷۵
بزمِ ادب		
اُردو شاعری کے فکری اور انقلابی پہلو	ارشد غازی	۹۵
طرحی غزل	سرفراز بزمی	۱۰۶
غزل	فیاضؔ احمد علیگ	۱۰۷
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۱۰۸
اخبارِ انجمن	صباح الدین ملک فلاحی	۱۱۰

مقالہ نگاران

۱-مولانا ظفر احمد الاثری، اسلامک دعوہ سینٹر، یوکے اسلامک مشن، برطانیہ

۲- ڈاکٹر رضوان الحق فلاحی، اسسٹنٹ ٹیچر، گورکھپور

۳۔ جناب عبداللہ زکریا، علاء الدین پٹی، مقیم حال ممبئی

۴۔ رضوان احمد فلاحی، لندن

۵- پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی، پروفیسر وسابق صدر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۶ - ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۷- ڈاکٹر شمشاد عالم، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۸-ارشد غازی، ڈائریکٹر اکیڈمی آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز (اساس) علی گڑھ

۹۔ سرفراز بزمی فلاحی، سوائی مادھوپور، راجستھان

۱۰۔ ڈاکٹر فیاض احمد علیگ، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ تحفظی وسماجی طب، غوثیہ یونانی میڈیکل کالج، فتح پور۔ یوپی

۱۱۔ مولانا مصباح الباری فلاحی، استاد جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

۱۲۔ مولانا صباح الدین ملک فلاحی قاسمی، استاد فقہ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ یوپی

۱۳۔ مولانا عبیداللہ طاہر فلاحی، نائب مہتمم جامعۃ الفلاح

۱۴- ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مدیر حیات نو، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

اسلامی مدارس: فارغین اورانجمنیں

زیرِ نظر عنوان میں 'تعلیمی ادارے' کے بجائے 'اسلامی مدارس' کی لفظی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ کیوں کہ مدارس اسلامیہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کے قلعے ہیں۔ یہاں تعلیمی ادارے کی ترکیب استعمال نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی کارکردگی کے اظہار کے لیے 'دینی اور دنیاوی تعلیم' کی اصطلاح کا سہارا لینا پڑتا ہے، جو خود تعلیم کی تعریف اور اس کے فہم کا قصور ہے۔ البتہ مدارس میں 'علم نافع' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جو تعلیم کی دوئی کو ختم کرتی ہے اور تعلیم کا بھرپور تعارف بھی کراتی ہے۔

بہرِ کیف اسلامی مدارس 'دینی قلعوں' کا استعارہ ہیں۔ انہیں قلعے اس لیے کہا جاتا ہے کہ قلعوں کے اندر سرحدوں کے محافظ رہتے بستے ہیں۔ ان کی تربیت وتطہیر کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ ان کے اندر ملک وقوم سے محبت وعشق کے جذبوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ان کی فصیلیں اس قدر مستحکم ہوتی ہیں کہ دشمن آسانی سے نہ داخل ہوسکتا ہے اور نہ نقب زنی کرسکتا ہے۔ بایں برآں اسلامی درس گاہیں/مدارس بھی تعلیم وتعلم اور تحقیق و تدریس کے عظیم مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی مدارس رجال گری کرتے ہیں جو اسلامی تراث وتہذیب کی تشریح وتعبیر کرتے ہیں، علم وتحقیق میں صفت تقویٰ کو شامل کرتے ہیں، رب کائنات کے شاہ کار کلام کی تفسیر و تاویل کے ذریعہ ملک وقوم کے لیے عملی زادِ راہ فراہم کرتے ہیں، ان ہی مدارس کا فیض ہے کہ پوری دنیا میں رجوع الی القرآن کے مہم باز، اقامتِ دین کے دعاۃ اور فکرِ اسلامی کے شہباز تیار کیے جاتے ہیں۔ بلاشبہ مدارس اسلامیہ کے اس حقیقی کردار کی بحالی وبجا آوری کا ہنر وسلیقہ اور خواہش وعمل کی توفیق انہی نفوس کو ملتی ہے جو اس کے حقیقی تاریخی کردار کا فہم رکھتے ہیں اور اس فہم کو عام کرنے میں کتمانِ حق سے کام نہیں لیتے۔

بھارت کے اسلامی مدارس/درس گاہوں/مکاتب کا آغاز یوں تو اسی وقت سے ہوگیا تھا جب محمد بن قاسمؒ (م ۷۱۵ء) نے سندھ کے مقام پر چند سال سکونت اختیار کی، اسلامی مدارس کی سرپرستی کی اور ہندوستان میں مفسرین، محدثین اور فضلاء کی اولین ٹیم کو تیار کردی۔ البتہ عہدِ اکبری میں فتح اللہ شیرازیؒ (م ۱۵۸۸) کے ذریعہ ایک نصاب کی بِنا اور اورنگ زیب عالم گیرؒ (م ۱۷۰۷ء) کے ذریعہ ایک ہمہ گیر نصاب کی تنفیذ عمل میں آئی اور ان کی سرپرستی میں قطب الدین سہالوی فرنگی محلیؒ (م ۱۶۹۱) نیز ملا نظام الدین زنگی محلیؒ (م ۱۷۴۸) کی کاوشیں اسلامی مدارس کی نصابی سرگرمیوں کی تاریخ بیان کرتی ہیں، جن کی صیقل گری میں شاہ عبدالرحیمؒ (م ۱۷۱۸ء) اور

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م۱۷۶۲) کے وژن سنہری حروف سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔(ہندوستان کی تعلیمی تحریکات، مقصد اور نصاب کا تجزیاتی مطالعہ، مشمول: تاریخ جامعۃ الفلاح، باب اول، ادارۂ علمیہ جامعۃ الفاح، بلریا گنج اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء ترتیب وتدوین: ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی)

اس بحث سے قطع نظر کہ 'درسِ نظامی' میں حذف واضافہ نیز نصاب کی جدید کاری میں ندوۃ العلماء میں رہ کر علامہ شبلیؒ (م۱۹۱۴ء) نے کیا کچھ اصلاحات کیں یا علامہ حمید الدین فراہیؒ (۱۹۳۰) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۷۹ء) نے مزید کیا اقدامات کیے، زیادہ مفید پہلو یہ ہوگا کہ بھارت کے تمام اسلامی مدارس نے ملک عزیز میں تمدنی وثقافتی پہلوؤں سے کیا خدمات انجام دیں۔ چنانچہ بطور مثال کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک ملک عزیز کو انگریزوں سے پاک وصاف کرنے میں دارالعلوم دیوبند (قیام: ۱۸۶۶) کا کردار تاریخی طور پر مسلم ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ اسلامی مدارس کے تعلیمی نظام یا نصاب پر گفتگو کرتے وقت ان کے زمانۂ قیام اور اس دور کی سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی صورتِ حال کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تبھی ہم تمام اسلامی مدارس کے عظیم کردار کی حقیقی قدر کرسکیں گے۔ ورنہ بعض 'اصطلاحات' پر ہم اصرار کریں گے اور کہیں ان کا چرچہ وچلن نہ پاکر یا تو بددلی و مایوسی کا شکار ہوں گے یا بے جا تنقیص وتخفیف کے مرتکب بنیں گے۔ (دیکھیں: علم کا اسلامی تناظر، اداریہ حیاتِ نو، فروری ۲۰۲۱ء)

مقامِ شکر ہے کہ بھارتی مدارس اسلامیہ کو ان کے فارغین اپنی انفرادی واجتماعی کوششوں کے ذریعہ زندہ و توانا رکھتے ہیں اور یہ پہلو عصری دانش گاہوں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً ابنائے قدیم مسلم یونی ورسٹی ملکی و عالمی سطح پر اس کے وقار اور تحفظ کی ضمانت لیتے ہیں اور مادر درس گاہ کو شرپسندوں کی شرارتوں سے بچانے میں کسی طرح کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے، علم وتحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی فکر کرتے ہیں اور تعلیمی وثقافتی تھنک ٹینک کی نئی نئی کہکشائیں آباد کرتے جاتے ہیں۔ افسوس کہ اسلامی درس گاہوں (اسلامی قلعوں) کے فارغین اور ان کی انجمنوں کے یہاں ایثار وقربانی اور مادر درس گاہ کے لیے وہ تڑپ اور محبت دکھائی نہیں دیتی، جو ان سے مطلوب ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ استثناء ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے متعدد وجوہات ہوسکتے ہیں جن کے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ملک عزیز کی عظیم درس گاہوں: دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، جامعہ اسلامیہ بنارس، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے ابنائے قدیم، اپنی مادرِ علمی کی نیک نامی، ترقی اور سرخروئی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ درحقیقت مدارس کے فارغین فکری وعملی طور پر اپنے مدارس کے سفیر ہوتے ہیں، جن کی مؤثر

نمائندگی ان کی انجمنیں کرتی ہیں۔اس طرح اسلامی مدارس کے انجمنوں کا ایک مربوط و منظّم دائرۂ فکر و عمل ہے، جو اس قلعے کا محافظ و نگراں بھی ہے۔ان مدارس نے علمِ نافع پر مبنی اپنے نصاب کے ذریعہ ملک عزیز کے لیے ہونہار، جفاکش، خداترس اور باکردار شہری بنائے ہیں۔انھوں نے خدمت خلق کے اداروں اور صحت و تعلیم کے میدانوں میں بلالحاظ مذہب،قوم،زبان اور خطہ،تمام باشندگانِ ملک کی خبر گیری کی ہے۔افسوس کہ ان کی خدمات کا اعتراف حکومتی سطح سے نہیں کیا جاتا اور ہمارے مسلم دانش ور بھی اس معاملے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

اربابِ مدارس نے اپنے ابنائے قدیم کی تاریخیں بہت کم مرتب کی ہیں، اگر ایسا ہوجاتا تو ان کے ذریعہ ان کے اہداف اور اثرات کا اندازہ لگانا آسان ہوتا۔ ہر مدرسہ/مکتبۂ فکر کو نصابِ تعلیم، نظام تعلیم اور غیر تدریسی سرگرمیوں پر مشتمل اپنی تاریخ مرتب کرنا چاہیے۔اس دستاویز کے ذریعہ فارغین اور ارباب مدارس کو خوشی اور شادمانی کا احساس ہوگا کہ انھوں نے تنگی اور عسرت کے باوجود انسان بنائے اور انسانیت کو فروغ دیا ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ مرتب شکل میں دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی تاریخیں تصنیف کی ہیں۔تعلیم و تعلم اور دعوت و تبلیغ نیز دیگر میدانوں میں ان کے فضلاء کی بیش بہا خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مدارس کے اہداف واثرات پر اس مختصر تحریر میں کچھ بیان کرنا مشکل ہے اور نہ یہ اس کا محل ہے۔تاہم تاریخ دالعلوم دیوبند کی دوجلدیں (مرتبہ: سید محبوب رضوی) اس اعتبار سے ہمارے سامنے ایک آئینہ پیش کرتی ہیں کہ اس ادارے کے ابنائے قدیم نے ۷۸۔۱۹۷۷ء تک کی علمی، فنی، عملی اور دعوتی میدانوں میں جو خدمات پیش کی ہیں وہ یقیناً قابلِ ستائش ہیں۔سطور ذیل میں بعض اشارات کیے جاتے ہیں۔ مذکورہ تاریخ کے بعد بھی اس ادارے کی ترکتازیاں چشم کشا ہیں، خصوصاً بھارت میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی نشر و اشاعت، سیاست میں فارغین کی شراکت داری اور خدمت خلق کے میدانوں میں مختلف اداروں، اکیڈمیوں اور این جی اوز کے قیام کے ذریعہ ان کی نمایاں خدمات محسوس ہوتی ہیں:

تاریخ دار العلوم دیوبند کی جلد دوم، باب اول میں سو (۱۰۰) علماء کرام کی سوانح عمریاں درج کی گئی ہیں۔ان علماء میں سے ہر ایک نے قرآن و حدیث، فقہ و فتاویٰ اور دعوت و ارشاد کے علاوہ مختلف شعبۂ جات میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ان میں متعدد علماء نے ہندوستان کے مناظراتی دور میں تحفظ اسلام کی خدمت کی اور شدھی اور سنگھٹن کے زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کا تحفظ کیا، فرقہ وارانہ فسادات میں باز آبادکاری کی، مسلم پرسنل لا کا تحفظ کیا اور دار القضاء وغیرہ وہ عنوانات ہیں، جن کے تحت فارغین دیوبند کی خدمات جلی حروف سے لکھے جانے کی مستحق ہیں۔

اس اجمال کی روشنی میں دیگر مدارس اسلامیہ کے ساتھ فارغین جامعۃ الفلاح اوراس کی انجمن کو اپنا احتساب و جائزہ لینا چاہیے۔اگر مقصد جامعہ کے حصول میں خاطر خواہ پیش رفت ہوئی ہے تو خدائے ذوالجلال کا شکرادا کرنا چاہیے۔اگر کوتاہی سرزد ہورہی ہے تو امراض واسباب کا جائزہ لینا چاہیے اور تدارک کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ کامیابیوں اور ناکامیوں میں اساتذۂ کرام، فارغین جامعہ، ارباب جامعہ اور انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح سب شریک وسہیم ہیں۔تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ قیام جامعہ (۱۹۶۲ء) کے وقت ہی سے مختلف سطحوں پر احتساب کا عمل جاری ہے۔ چنانچہ مجلس تعلیمی اور مجلس انتظامیہ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام ونصاب میں مسلسل پیش رفت ہوئی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ قرآن وسنت کی رہ نمائی میں جامعۃ الفلاح کے تعلیمی وتربیتی نظام ونصاب کو درست رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔البتہ نظام تعلیم، نصاب اور تربیت کے تینوں پہلو نہایت حساس ہیں اور مفید نتائج کے لیے ہر سطح پر عظیم قربانی کے طالب۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح نے اپنے زمانۂ قیام (۱۹۷۷ء) سے ہی مادر درس گاہ کی خیر خواہی فکری و عملی سطح پر کی ہے۔مولانا ابوالمکارم فلاحی سے لے کر نومنتخب صدر برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی تک مادر درس گاہ کی تئیں مخلص رہے ہیں۔صدور اور سکریٹری صاحبان کو اجتماعی اشتراک عمل کے ذریعہ منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ انسانی بس میں جس قدر شفافیت ممکن رہی، بروئے کار لانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی جاتی رہی ہے۔ یہ انجمن ایک تحریری دستور کے تحت اپنی سرگرمیاں انجام دیتی ہے۔ ملک و بیرونِ ملک میں بکھرے ہوئے تقریباً تین ہزار فارغین اپنے نمائندوں کی وساطت سے اپنے صدر کا انتخاب کرتے ہیں۔ضرورت ہے کہ انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی مفصل تاریخ مرتب کی جائے تاکہ ابنائے جامعہ کو اپنی انجمن کی علمی وتحقیقی، دعوتی اور تدریسی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا اندازہ ہوسکے۔

راقم کے بعض ندوی، قاسمی اور اصلاحی ساتھی انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی اندرونی مضبوطی اور فارغین کی بیرونی سرگرمیوں سے بہت خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات اکثر وبیشتر نامہ و پیغام بھیجتے رہتے ہیں۔راقم اللہ کا شکرادا کرتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ کاش ایسا ہی ہوتا!

۶/جون ۲۰۲۱ء کا آن لائن انتخابی عمل، انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی تاریخ میں نہایت اہم دن ہے۔اجتماعیتوں اور انجمنوں کی تاریخ میں بعض لمحات تاریخی نوعیت کے ہوتے ہیں اور خالق کون ومکاں ان کے ذریعہ تزکیہ وتطہیر، ایثار وقربانی اور ریا وغور کی قلعی بھی کھولتا رہتا ہے۔ درحقیقت یہ تاریخی لمحات نہایت نازک ہوتے ہیں۔ ہر نازک موقع پر رسول اللہ ﷺ کی یہ نصیحت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے: **الکیس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت**۔(داناوہی ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے توشہ تیار کرتا ہے۔)

اس اہم تاریخی دن کی ایک مختصر روداد اور اشکالات کا جواب اس شمارہ جولائی کے کالم میں 'اخبارِ انجمن' میں نظر نواز کیا جا سکتا ہے۔ تحریکِ اسلامی کے امتیازات میں سے ایک امتیاز حرکت و عمل اور اجتہاد ہے۔ چنانچہ یہ آن لائن انتخابی عمل بھی ایک اجتہادی عمل تھا، جو اپنی 'محدودیتوں' کے ساتھ ایک شفاف انتخاب ثابت ہوا۔ اب جملہ ابنائے قدیم کی دینی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ کووِڈ کی اس مشکل ترین گھڑی میں 'انجمن' کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں اور اقامتِ دین کے داعی جامعۃ الفلاح کا نام روشن کریں اور ہمیشہ کی طرح خیر کے کاموں میں بھی مسابقت کریں۔

مقام شکر ہے کہ ۱۴/نومبر ۱۹۷۷ء تا ۶/جون ۲۰۲۱ء تک انجمن طلبۂ قدیم کے اجتماعی اشتراک و عمل سے منتخب ہونے والے تمام صدور ابھی الحمدللہ باحیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمروں کو صحت و تندرستی کے ساتھ دراز کرے، آمین۔ اس تحریر کے توسط سے راقم جملہ فارغین جامعہ اور بطور خاص ان صدور کی خدمات کی ستائش کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ جس طرح انھوں نے اپنے 'دور' میں 'مینارِ فلاح' کی عظمتوں کو سلام کیا ہے، آج بھی یہی مینار آپ سے آپ کا خلوص چاہتا ہے۔ بلاشبہ جملہ سکریٹری صاحبان، خازن حضرات، ممبرانِ شوریٰ اور نمائندگان نیز عام فارغین کی انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کے ذریعہ ہی فلاح نیک نامی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے۔ آیئے آخر میں آیت کریمہ کی تلاوت کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيراً (النساء: ۱۳۵)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو۔ اگر چہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتے داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔)

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۲۳/جون ۲۰۲۱ء / ۱۴/ذی قعدہ ۱۴۴۲ھ

افادات جلیل احسن ندویؒ (قسط۔۱۹)

مولانا ظفر احمد الاثری

سورۂ الشعراء

یہ دونوں سورتیں ہم مضمون ہیں: یعنی سورہ فرقان اور سورۂ الشعراء۔ (آیت ۱) یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔ لہٰذا معجزہ کی کیا ضرورت ہے، اس نے اپنی دلالت اور وضاحت سے بیان کر دیے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ (آیت:۲) [**لعلک باخع نفسک**] شاید تم اپنی جان کو ہلکان کر دو، شاید تم اپنی جان دینے کے قریب ہو جاؤ گے۔ ان کے نہ ایمان لانے پر اتنی حسرت ہو رہی ہے کہ شاید یہ حسرت آپ کو ہلاکت کے قریب نہ پہنچا دے۔ [**ألا یکون المؤمنین**] ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے کڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چوں کہ آپ کتاب مبین کی آیتیں سنا رہے ہیں پھر بھی وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں، اس لیے آپ کڑھ رہے ہیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف قرآن کی آیات کو پہنچا دینا ہے۔ اصل میں رسول کے اندر درد ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں، جب کہ قرآن کی آیات اتنی واضح ہوتی ہیں۔ جنہیں انکار کرنے کا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور یہ چیز رسول کے اندر فکرمندی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ (آیت ۴) اس آیت میں معجزہ مانگنے پر جواب دیا جا رہا ہے کہ ہماری قدرت میں یہ بات ہے کہ آسمان سے کوئی حسی معجزہ اتار دیں اور ایسا کرنے پر ان کی گردنیں جھک جائیں گی۔ یعنی اگر حسی معجزہ آ جائے تو ساری اکڑ نکل جائے گی۔ دراصل اس طرح کا مطالبہ ان کی تکذیب کا ایک طریقہ ہے۔ اس لیے یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ جب ایمان نہیں لائیں گے تو عذاب آ جائے گا اور یہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔ (آیت ۴) [**فظلت اعناقهم لها خاضعين**] خاضعین واقع حال ہے۔ امام فراہیؒ لکھتے ہیں کہ ''ظلت فعل تام ہے، ناقص نہیں اور خاضعین حال واقع ہے، **اعناقهم** میں **هم** کی ضمیر سے۔ اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مشکلات نحو میں سے ایک ہے۔ (۱) اور مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں: '' آیت میں

بظاہر خاضعین کی جگہ **خاضعة** ہونا تھا لیکن **اعناقهم** میں مضاف الیہ کی رعایت سے **خاضعین** آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔(۲)

[**محدث**] جب بھی کوئی نیا کلام کا حصہ اترتا ہے تو اس سے اعراض کرتے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یعنی جب کوئی نئی آیت اترتی ہے تو اس کا مذاق ہوتا ہے۔ [**فقد کنتم**] تو انھوں نے جھٹلایا، یہ ان کا فرد جرم ہے۔ (آیت ٦) قرآن انذار کرتا ہے کہ تکذیب کروگے تو عذاب آجائے گا تو اس کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ (آیت ۷) کیا انھوں نے زمین کو نہیں دیکھا، مردہ ہوتی ہے خشک ہوجاتی ہے پھر پانی برستا ہے، اس سے زمین میں شادابی آجاتی ہے، جس سے انسان اور حیوان دونوں ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (آیت ۷) بارش کے بعد جب کھیتی اوگتی ہے تو انسانی زندگی میں جان پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح وحی کی بارش ہوتی ہے، جو لوگ نرم قسم کے ہوتے ہیں تو اسے قبول کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو صالح نہیں ہوتے ہیں وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح زمین جو پانی کو جذب کرلیتی ہے، اس کے اندر زندگی آجاتی ہے اور جب زمین بنجر ہوتی ہے تو پانی کو قبول نہیں کرتی ہے۔ دراصل یہ بات بتائی جارہی ہے کہ ایک زندہ ملت اٹھنے جارہی ہے اور دوسرا گروہ جو جھٹلا رہا ہے تباہ ہونے جارہا ہے۔ (آیت ۸) احیاء امت پر استدلال ہے اور اماتت اخری پر استدلال ہے۔ یعنی ایک گروہ اٹھے گا اور دوسرا مرکر رہے گا۔ [آیة] **علی اهلاک امة اور احیاء امة.** [**ان فی ذالک لآیة**] ہم اسی طرح مؤمنین کو وحی کے ذریعہ زندگی بخشتے ہیں جس طرح پانی کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں اور مشرکین کی ہلاکت اسی طرح سے ہوگی جس طرح زمین خشک ہوکر مردہ ہوجاتی ہے۔ (**ان الارض المیتةاحیا ئها بانزال الامطار کذالک نحی المؤمنین بنزول الوحی و یدخل الایمان فی قلوبهم، وان الارض غیر صالحة للزرع بدون الماء فصارت میتة بانقطاع الماء کذالک المشر کون لم ینتفعوا بنزول الوحی فکادوا یهلکون**). [**اکثرهم**] باشندگان مکہ مراد ہیں۔ (آیت ۹) سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں نہیں ہلاک ہوتے ہیں؟ تو اس کا جواب دیا جارہا ہے۔ بے شک تیرا رب جب چاہے پکڑ سکتا ہے، لیکن وہ رحیم ہے، اس لیے اس نے مہلت دے رکھی ہے۔ اے مومنو! یقین رکھو کہ اس کے فیصلے کو کوئی روک نہیں سکتا وہ تمہارے لیے عزیز ہے اور تمہارے لیے رحیم ہے۔

[**العزیز و الحکیم**] مشرکین کی طرف رخ کردیا جائے تو مشرکین کو مہلت دے رکھی ہے، کیوں کہ وہ رحیم ہے۔ لیکن کسی وقت بھی پکڑ سکتا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ اس کا رخ مومنین کی طرف کیا جائے تو اس مطلب یہ

ہے کہ اس میں احیاء امت کی دلیل کے لیے ہے اور اس کے لیے اقوام ماضیہ سے دلیل دی جا رہی ہے۔ [واذا] مفعولیہ۔[لا یتقون] اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، ان کو توحید کی دعوت دو۔[اخاف] مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے بہت بڑے سرکش لوگ ہیں۔(آیت ۱۳) جب تقریر کرنی ہوتی ہے تو میرا سینہ تنگ ہوتا ہے، بھچتا ہے اور میری زبان خوب نہیں چلتی ہے اس لیے کہ دس سال تک میں مدین میں رہا۔ [یضیق] دل کے اندر ہمت نہیں ہے اور دل میں کشادگی محسوس نہیں کرتے ہیں۔[فارسل الی ھارون] ای ملائکۃ الوحی ۔اس طرح ہم دونوں مل کر کام کریں۔(آیت ۱۴) ان کا ہم نے خون کر دیا ہے تو ہمیں یہ اندیشہ ہے کہیں ہمیں قتل کر دیں۔(آیت ۱۵) اس دور میں اصل میں مسلمان کو تباہ کر رہے ہیں۔[بآیاتنا] ہمارا معجزہ لے کر جاؤ۔[معکم] تمہارے ساتھی ہیں اور حامی وناصر ہیں۔

(آیت ۱۶) ہم میں سے ہر ایک رسول ہے اور دونوں ہی رسول تھے [الرسول الوزیر لموسی] (آیت ۱۷) [فقال ان ارسل معنا بنی اسرائیل] ان دونوں نے فرعون سے کہا بنی اسرائیل کو غلامی کے طوق سے آزاد کریں۔(آیت ۱۸) فرعون موسی کو مرعوب کرنا چاہتا ہے اور موسی سے مخاطب ہوتا ہے کہ تو، تو یہاں بچہ تھا اور ہمارے یہاں پلا بڑھا اور ہم ہی کو دعوت دینے آیا ہے۔(آیت ۱۹) ہماری نعمتوں کی ناشکری کی۔[فعلۃ] کرتوت، قبطی کو مار ڈالا تھا۔(آیت ۲۰) اب نبوت کے زمانے میں ہم نے نہیں کیا اس سے اب نبوت پر کیا اثر پڑے گا۔

(آیت ۲۱) یہ اندیشہ تھا کہ تم لوگ مار ڈالو گے اس لیے میں بھاگا۔(آیت ۲۲) وہ ایک احسان ہے جو تو مجھ پر جتاتا ہے، وہ احسان اس وجہ سے ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور قتل کرنے کا پلان بنا رکھا تھا۔[تلک] مبدل منہ [نعمۃ] مبدل، بیان۔صفت ملکر مبتدا۔اگر آپ نے غلام نہ بنایا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ [عن] جو تم پر جتاتا ہے۔[وتلک نعمۃ تمنھا علی] مبتدا۔[ان عبدت بن اسرائیل] خبر۔آپ کا احسان مجھ پر یہ ہے۔[ان عبدت] تمام ظلم جو فرعون نے کیا۔دوسری ترکیب، تلک، مبھم ،[ان عبدت بنی اسرئیل] بدل، [نعمۃ تمنھا] خبر،(الکشاف)[تلک] اشارہ مبھم ، [نعمۃ تمنھا] تفسیر تلک[ان عبدت] خبر۔یہ رامسس (ثانی اور لقب فرعون) کے زمانے میں گئے اور اسی رامسس کے زمانہ میں موسیٰ کے ہاتھوں سے ایک قبطی کا قتل ہو گیا تھا۔(آیت ۲۳) تم جس رب العالمین کی دعوت دے رہے ہو وہ کیا ہے، رب العالمین تو میں ہوں، تم کس رب العالمین کی دعوت دیتے ہو۔(آیت ۲۴) اگر دلائل پر یقین کر لو تو معلوم

ہوگا جو میں کہہ رہا ہوں وہی خدا ہے۔

(آیت ۲۶) جس خدا کی دعوت دیتا ہوں وہ خدا تمھارا بھی ہے اور ہمارا بھی ہے۔ (آیت ۲۷) یہ تمھارا رسول مجنون ہے۔ (آیت ۲۸) تقریر جاری ہے اور کہا جا رہا ہے کہ وہ مشرق ومغرب کا رب ہے، فرعون کہتا ہے کہ میں سورج وغیرہ کا دیوتا ہوں موسی نے کہا کہ تم جس کی تم عبادت کررہے ہو وہ ہمارے رب کے قبضے میں ہے۔ (آیت ۲۸) ہر اقتدار والا یہی کہتا ہے اگر میرے علاوہ الہ بنادوگے تو جیل میں ڈال دونگا۔ (آیت ۳۰) ایک معجزہ لایا ہوں (آیت ۳۱) اس کو لاؤ پیش کرو۔

(آیت ۳۲) غیر مشتبہ حقیقی سانپ بن گیا۔ (آیت ۳۳) اپنا ہاتھ گریبان میں لے گئے پس دفعتاً وہ سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ [ھی] یعنی ہاتھ سورج کی طرح چمکنے لگا۔ (آیت ۳۴) اپنے سحر میں بڑا امام ہے۔ (آیت ۳۵) یہ جادو چل گیا تو اسرائیلی اقتدار آجائے گا تو یہ سن کر فرعون نے کہا تب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ [ارجه] اس کو اور موسی کو بھیجو، یہ مجلس برخاست کرو، [حاشرین] سبھوں کو شہروں میں بھیجو۔

(آیت ۳۷) [لیاتوک] امر کے جواب میں ہے۔ (آیت ۳۸) پس ساحر لوگ ایک متعین دن کے دعوے پر جمع کئے گئے۔ (آیت ۔۴۰ ۔۳۹) لوگوں میں اعلان کیا گیا یعنی اکٹھا ہونا ہے، امید ہے کہ سارے لوگ اسی کی پیروی کریں گے۔ اس کا جو دین ہوگا وہی سب کا ہوگا، یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس مقابلہ میں موسی ہار جائیں گے۔ (آیت ۴۱) ان کو یقین ہے کہ ہم ان کو شکست دے دیں گے۔ (آیت ۴۲) [اذاً] شرط کے لیے آیا ہے۔ (۳) [قال نعم و انکم اذاً لمن المقربین] اور سورہ اعراف میں یوں ہے [قال نعم و انکم لمن القربین] (۴) (آیت ۴۴) انھوں نے کہا، فرعون کے اقتدار کے سہارے شروع کررہے ہیں، بڑا غرا تھا۔ ان کی رسی اور لاٹھیاں سانپ بن گئیں۔ [تلقف] چونکہ ان کا مصنوعی تھا اس لئے وہ تھوڑی ہی دیر باقی رہ سکیں۔

(آیت ۴۶) حقیقت کو دیکھ کر وہ سجدہ میں گر گئے۔ [ساجدین] مؤمنین (آیت ۴۷) ہم ایمان لائے اس رب العالمین پر جو ھارون اور موسی کا رب ہے۔ (آیت ۴۹) یہ بات اس لئے کہہ رہا ہے تاکہ مصریوں کے ذہن کو پھیر دے۔ تم میری اجازت ملنے سے پہلے ایمان لے آئے [انہ لکبیر کم] یہ تمہارا استاد ہے، میرے بغیر اذن کے کام کرنے کے نتیجہ کو جان جاؤ گے۔ اور اپنا انجام جان لوگے۔ اور سولی پر چڑھا دونگا تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ [لا ضیر] کوئی نقصان نہیں ہے۔ مرنا تو تھا ہی، اور قربانی دی ہے اور اب قبطیوں کے اندر اسلام کا دروازہ کھلا اس لئے کہ وہاں ابدی زندگی ملے گی۔ ہم نے عمر فانی کھوئی وہاں اخروی

حیات ملے گی ہم تو فائدے میں ہیں اسے قربان کرنا ہی تھا، ہمارا کل ہی فائدہ ہی ہے۔[ضیر]**بل ربح فی ربح**۔
(آیت ۵۱) ہم خواہش مند ہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔[**ان کنا اول المسلمین**] (یعنی قبطی مشرکین میں) ہم قبطیوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔ یہ ہم نے قربانی دی، شاید ہماری مغفرت فرمادے۔ (آیت ۵۲) فرشتے کے ذریعہ ہدایت کی، میرے بندوں کے ذریعہ نکل جاؤ اس کے بعد قتل کی سازش ہوئی۔ اس کے بعد یہ حکم ہوا۔ (آیت ۵۳) [**حاشر**] ہرکارے۔ ان کو تمام چھاؤنیوں میں بھیجے تاکہ تمام فوجیوں کو لے آئیں۔[**حاشر**] **لیحشر الجنود** ۔(آیت ۵۴)[قلیل] حقیر، یہ احتیاطی تدبیر ہے، تاکہ قوم کو خلش نہ ہو (آیت ۵۶) ہم کو انھوں نے اپنے کردار سے بہت غصہ دلایا۔
(آیت ۵۷) اندر بغاوت نہیں ہے، ہم جو کہہ رہے ہیں، ساری فوجیں اکٹھی ہو جائیں۔ اور یہ خود قیادت کر رہا ہے۔ (آیت ۵۸) مصری قوم کا جو مکھن ہے وہ نکال کر ملا، ان کو زمین سے بے دخل کر دیا۔[**کذالک**](**الامر**) ان کے پاس کنوز تھے اور تمام چیزیں تھیں۔ اسرائیلی قوت کا مرکز مصر تھا، یہی سینٹر تھا، یا پھر یہی چیزیں دوسری جگہ ملیں۔ اس کے بعد قبطی قوم اقتدار کو پا نہیں سکے۔ ایک قوم فلاح پائی اور دوسری قوم ناکامی ہوئی۔[**فاتبعوھم**] دن نکلتے نکلتے فرعونی فوج اسرائیلی فوج کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔
(آیت ۶۳) جب دونوں مقابل میں آگئے تو اصحاب موسی نے کہا اب ہم پکڑ گئے تو موسی نے کہا ہرگز نہیں ایسی بات نہیں۔ (آیت ۶۳) اللہ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہمارا ھادی ہے اور ہمارا ناصر ہے، موسی کو بتلا دیا گیا کہ تم فلاں جگہ جانا ہے، یہ بحر قلزم میں واقعہ پیش آیا۔ (آیت ۶۴) یہ ٹکڑا مانند پہاڑ کے ہو گیا، لاٹھی مارنے کی وجہ سے ایسا ہوا، اور پانی دونوں طرف سے جم گیا۔ (آیت ۴۶) فرعون کو قریب کیا،، اور فرعونیوں کو ڈبو دیا۔ اس میں جس طرح نشانی ہے کہ موسی کو حیات ملی، نصیب ہوئی۔ اسی طرح مؤمنین کو بھی ایک نئی زندگی ملے گی۔ اور فرعون کو جس طرح ناکامی ہوئی اسی طرح مشرکین بھی ناکام ہو جائیں گے۔ ان میں بیشتر لوگ نہیں مؤمنین ہیں اس لیے کہ یہ عذاب کے مستحق ہیں، اور عذاب نہیں آرہا ہے اس لئے کہ وہ عزیز رحیم ہے۔ اس میں مؤمنین کو تسلی ہے۔[**علیھم**] **ھم** سے مراد کفار مکہ ہیں۔ یہ بتلاؤ کہ کون تباہ ہوا، اور ابراہیمؑ کیا دعوت لیکر آئے تھے کیونکہ یہ ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ (آیت ۷۰)[**ھل**] تحقیر کے لئے ہے۔ بے جان کی کیوں پرستش کرتے ہو۔
(آیت ۷۱) ان کے پاس تو دلیل تھی ہی نہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم انہیں پوجیں گے۔ تمہاری بات نہیں سنیں گے، یہ ان کی تکذیب ہے اور اشراک باللہ کی تصویر ہے۔ (آیت ۷۲) کیا وہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں،

(آیت۷۳)ان سوالات کا جواب نہیں دیتے۔(آیت۷۴)[بل] چاہے جوکچھ سنتے ہوں یا نہ سنتے ہوں، میں نے اپنے آباءکوکرتے ہوئے پایا، لہٰذا اسی کی عبادت کریں گے۔(آیت۷۵)ذرا بتاؤ سہی![ما کنتم] مبتدا [فانھم]خبر۔(آیت۷۸)البتہ وہ میرا مرکز محبت ہے۔(آیت۷۷)تمہارے یہ معبودین میرے دشمن ہیں۔ان کی قوم مشرکین کی طرح تھی، یہ خدا کو مانتے تھے لیکن خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے۔[رب العالمین]مبتدا[فھو خبر [فانا احب].

[فھو یھدینی]وہ ہرطرح کی ہدایت دے رہا ہے،سلام کا راستہ دیا،فطری روشنی دی۔(آیت۸۱) مستقبل کے معنی میں ہے، جو ان صفات کا حامل ہو اسی کو الوہیت کا حق پہنچتا ہے،جس کو تم لوگ پوجتے ہو وہ ان صفات کا حامل نہیں ہے،تو پھر کیوں پوجتے ہو۔اس کے بعد ہجرت ہو جاتی ہے۔[الحقنی] پہلے جو انبیاء گزر چکے ہیں ان کے ساتھ شریک کر۔[لسان صدق]اچھی شہرت دے تاکہ بعد میں آنے والے لوگ مجھے اچھے ناموں سے یاد کریں گے اور پکاریں گے۔(آیت۸۶) غلط کار تھا اس لئے اس کی مغفرت فرما، جب تک اللہ نے منع نہیں کیا اس وقت تک دعا کرتے ہیں۔(آیت۸۷) اپنی رحمت سے قیامت کے دن محروم نہ کرو۔(آیت۸۸)[یوم] یہ الگ طور سے شروع ہوا ہے۔اس دن کا تصور کرو جب کہ کوئی مال و دولت اور سیاسی طاقت کچھ کام نہیں آئے گی۔آل ابراہیم کو سمجھایا جا رہا ہے۔(آیت۸۹) [الا من اتی]مبتدا۔ شرک سے پاک دل لیے ہوئے[فھو ناج] خبر ہے ۔آل ابراہیم میں شمار ہونے کی وجہ سے اور یہ خیال کہ ہمارے اوپر رحمت کی بارش ہوتی ہے تو وہاں یہ منطق کام نہیں آئے گی۔(آیت۹۰)

جنت متقیوں کے قریب ہوگی۔(آیت۹۱) شرک کرنے سے جہنم قریب کر دی جائے گی۔(آیت۹۲۔۹۳) کیا وہ خود اپنی مدد یا دوسروں کی مدد کر سکیں گے آج! مطلب یہ ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی طاقت ہے تو خدا کے عذاب کو اپنے آپ سے بچا لیں۔[من دون اللہ] سے اشرار جن مراد ہیں،اور جنوں کو خوب معلوم ہے ہم جہنم میں جائیں گے۔(آیت۹۴) [غاؤن] گمراہ اور شرک کے پیروکار،[ھم]،اوندھے منھ گرادیے جائیں گے۔(آیت۹۵)ابلیس کو جو لوگ بھی مانیں گے سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔

(آیت۹۶) سب آپس میں بحث کر رہے ہیں۔یہ جھگڑا دشمنوں کا ہے(آیت ۹۷) ہم گمرہی میں تھے۔(آیت۹۸)رب العالمین کے برابری کا درجہ تمہیں دیتے تھے اور تمہاری قربانی کرتے تھے۔ (آیت۹۹)افسوس کا کلمہ کہیں گے کہ ہمیں ان بدمعاشوں نے گمراہ کیا۔]مجرمون]اشرار جن، لیڈر۔

(آیت۱۰۰)[فمالنا] کوئی بھی شافع نہیں ہوگا۔(آیت۱۰۱)اور نہ کوئی دوست ہوگا۔(آیت۱۰۲) [کرۃ]اسم،اگر ایک مرتبہ لوٹا دیئے جائیں تو۔(آیت۱۰۳)[لآیۃ]اس میں مشرکین مکہ کومہلت دی گئی ہے۔ یہ ابراہیم کی اولاد ہیں اور ابراہیمؑ کے اندر نشانی ہے۔(آیت۱۰۵)نوح کوجھٹلایا تو تمام رسول کوجھٹلایا۔[اذ] بدل اشتمال۔(آیت۱۰۶)اللہ کے عذاب سے بچنے کی تدبیر کرو۔یعنی مجھ پر ایمان لاؤ۔(آیت۱۰۷)میں تمھیں گڑھے میں نہیں گراؤنگا۔(آیت۱۰۸)اطاعت کرنا ہی اتقاء ہے۔(آیت۱۰۹)اپنا اقتدار کا ٹھاٹ جمانے کے لیے ایسا کیا ہوا ہے،حالاں کہ ایسی بات نہیں۔

(آیت۱۱۰)توحید اختیار کرو۔(آیت۱۱۱)اس کے جواب میں کہا کہ ہم تیری اتباع کیسے کریں گے جب کہ تیرے متبعین معاشرہ میں ہر لحاظ سے پست لوگ ہیں،اور اجتماعی لحاظ سے بھی۔پھر تو ہم اور وہ کیسے مساوی درجے میں ہوجائیں گے اور ایک رتبہ اختیار حاصل کریں گے جبکہ وہ معاشرہ میں گرے ہوئے لوگ ہیں۔(آیت۱۱۲)یہ اعتراض نقل کیا جارہا ہے۔(جو حضرت نوحؑ پر ایمان لاچکے ہیں)ان کی عقل میں گودا نہیں ہے،کیا ان کے عمل پر ایمان لائیں گے،ان کے عمل اور ایمان کا اعتبار نہیں ہے،نوحؑ کہتے ہیں کہ میں کیا جانوں وہ کیا کرتے رہے ہیں،میں تو ظاہر دیکھونگا،یہ لہر کی وجہ سے ایمان لے آئے۔[بما کانو یعملون] یہ مخلص لوگ ہیں،جو کچھ وہ کرتے ہیں یہ ان کے خلوص کی دلیل ہے،تم جو کہتے ہو کہ ان کا ایمان بے کار ہے یہ صحیح نہیں ہے ان کے خیال کی پوری تردید کرتے ہیں۔

(آیت۱۱۳)ان کا بدلہ پورا ملے گا اور تم چاہتے ہو یہ بات نہ ہو اور تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ارزل لوگ نہیں ہیں بلکہ ایمان نے ان کو اونچا کردیا ہے۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں "لو تشعرون یعنی اگر اس حقیقت کا احساس تمھیں بھی ہوتا تو تم بھی وہی کہتے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن تمہارے ذہنوں میں یہ خناس سمایا ہوا ہے کہ شرافت ورزالت کا انحصار مال ودولت پر ہے،اس وجہ سے ان کی غریبی تمہارے لیے قبول حق میں حجاب بن گئی ہے۔" [تدبر قرآن،جلد ۵] سورہ الشعراء آیت (۱۱۳) اور مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ "یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ان کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب،محنت پیشہ،اور ادنی درجے کی خدمات انجام دینے والے ہیں یا معاشرہ کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں،ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ علم وعقل اور سمجھ سےء عاری ہوتے ہیں اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر وبصیرت پر مبنی،نہ ان کا اعتقاد لائق اعتبار اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔حضرت نوحؑ اس کے

جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آکر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے میرا اور تمہارا کام نہیں ہے'' (تفہیم القرآن جلد۳ سورۃ الشعراء حاشیہ۸۲)

(آیت۱۱۴) ان کو اپنے سے بھگا نہیں سکتا۔ (آیت۱۱۶) **ان لم ینتہ من الدعوۃ**۔ اگر تم اپنی دعوت سے باز نہیں آئے تو ہم لعنتی سزا دیں گے۔ (آیت۱۱۷) جب انھوں نے دھمکی دی تو انھوں نے کہا یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ (آیت۱۱۸) [**فافتح**] واضح انداز میں فیصلہ کرنا۔ ان میں جو نصرت کے مستحق ہیں ان کو نصرت عطا فرما اور جو عذاب کے مستحق ہیں ان کو عذاب دے [من] بیانیہ۔ [**فی الفلک**] حال یا فلک **مشحون** کے ذریعہ بچالیا۔

(آیت۱۲۰) کافرین کو غرق کر دیا۔ (آیت۱۲۸) [آیۃ] بڑے بڑے محلات، اقتدار کی نشانی [**تعبثون**] بے کار۔ [**مصانع**] کارخانے اس طرح بنائے۔ (آیت۱۳۰) ستاتے ہو ظالم بن کر، یعنی ان کا یہ دستور تھا کہ ملک میں عدل و انصاف کے بجائے ظلم کرو۔ (آیت۱۳۱) میرا نظام صالح اختیار کرو۔ (آیت۱۳۲) [**امدکم**] بڑھایا۔ افرادی طاقت ہے۔ (آیت۱۳۵) دنیا کا عذاب (آیت۱۳۶) وعظ اثر سے خالی ہے۔

(آیت۱۳۶) پہلے بھی بہت لوگ آتے رہے ہیں، پہلے بھی رسول آتے رہے ہیں۔ (آیت۱۶۰) ہمارے تمام رسول کو جھٹلایا، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے ہیں ان کو پہلے مبلغ بنا کر بھیجا، اور موجودہ اردن میں یہ علاقہ سدوم اور عمورہ کا ہے۔ چونکہ ان کی قوم کے درمیان زیادہ رہے اس لئے کہ وہ قوم کے فرد ہیں۔ اور اس لئے قرآن نے بھائی کہا۔ (آیت۱۶۵) [**عالمین**] مصر کو جانے والی شاہراہ عام پر یہ لوگ بستے تھے۔ اور طاقت ور قوم تھی اگر کوئی اجنبی ہوتا تو اسے لوٹ لیتے اور ان کے ساتھ بدمعاشی کرتے اور اس طرح باہر کے لوگوں کو اپنا نشانہ بناتے۔

(آیت۱۶۶) بیویوں کو ترک کر دیا تھا۔ [**بل قوم عادون**] بلاشبہ۔ تجاوز کرنے والے ہو۔ (آیت۱۶۷) اپنی ان اخلاقی دعوت سے باز نہیں آئے تو نکال دیئے جاؤ گے اور قابل لعنت قرار دیے جاؤ گے۔ (آیت۱۶۸) سخت ناپسند کرتا ہوں۔ (آیت۱۶۹) ان کے عمل کے نتیجے میں جو انجام آنے والا ہے اس سے بچا دے۔ [**عجوزاً**] ان کی بیوی نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ۔ اور ایمان نہیں لائی [**غابرین**]

ھالکین. [**ثم**] عطف، **نجینا** پر۔[**الآخرین**] **مکذبین** [**مطراً**] **مھلکاً.** جن کوڈرادیا گیا تھاوہ کتنا براعذاب تھا۔(آیت ۱۷۸) [**ایــکة**] سرسبز شاداب والے علاقے۔،اصحاب الایکة اصحاب مدین ہیں۔ (سورہ عنکبوت میں ہے **و الی مدین اخاھم شعیبا**(آیت ۳۶)[**الاتتقون**]عذاب آجائے گا اگرنہ مانوگے۔یہ تجارت پیشہ قوم ہیں۔[**الکیــل**] ناپنا، ناپنے کو پورا کرو۔ناپنے کا عمل پورا کرو۔(آیت ۱۸۱) [**المخســرین**] لوگوں کوخسارہ میں نہ ڈالو۔(آیت ۱۸۲) ٹھیک ٹھیک ناپو۔(آیت ۱۸۴) فسادمت مچاؤ۔ (آیت ۱۸۴) [**الجبلة**] لوگ۔ پہلے بھی ایسے کرتے تھےتو وہ ہلاک کردیے گئے۔(آیت ۱۸۷) **ان کنت رسولاً من الله فاسقط علینا کسفاً** ۔عذاب الٰہی کی دھمکی دے رہے ہو۔جس لوطی قوم کو ہلاک کیا تھا اسی طرح تم کوھلاک کردیے جاؤ گے۔(آیت ۱۸۹) نہیں مانا۔[**یوم الظلة**] وہ بادل جو پوری طرح چھا گیا، چھائے ہوئے بادل کے دن یا دھماکہ، زلزلہ کا دھماکہ ان کو پکڑ یا۔یہ دھماکہ تھا جو دوسری جگہ قرآن میں ہے [**فاخذھم الرجفة فاصبحوا فی دارھم جثمین** اور **و اخذت الذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دارھم جثمین**] یعنی یہ چھتری والا عذاب سے ہلاک ہوئے جوایک دھماکےاورزلزلہ کی شکل میں آیا یہی رائے مولانا مودودیؒ کی ہے(تفہیم القرآن جلد۳ الشعراء حاشیہ ۱۱۷)

(آیت ۱۹۱)[**تنزیل**]ای مُنزَّل ۔(آیت ۱۹۲)اس کولیکرروح الامین لےکرآئے ہیں۔ان ہی کے ساتھ عذاب برسانے والےفرشتے ہوتے ہیں۔فرشتوں کے بادشاہ ہیں۔[**به**] آپ کےقلب پراتاراہے۔ یہ سب سے زیادہ سخت قسم کی وحی ہوتی ہے، اپنی شکل میں آتے ہیں۔اوراس کو پیغمبر دیکھتا ہے۔اور پیغمبر جانتا ہے۔انبیاء کے قصے بیان کا مقصد یہ ہے کہ اس نصیحت حاصل کریں،اور وہ یہ ہے کہ جولوگ اس کو مانیں گے ان کے اندرزندگی آئے گیاور جونہیں مانیں گے،فنا کے گھاٹ اتاردیئے جائیں گے۔

(آیت ۱۹۵)[**بلسان**] حال ہے، یہ رائے ابن عاشور کی بھی ہےاورضمیر مجرور سے حال ہےاوراسکی تفسیر یوں کرتے ہیں''و [**بلسان**] **حال من الضمیر المجرور فی**[**نزل به الروح الامین**]**و الباء للملابسة.و اللسان: اللغة ای** [**نزل به الروح الامین**]**ای نزل بالقرآن ملابسا للغة عربیة مبینة ای کائنا القرآن بلغة عربیة.** دوسرے مفسرین بلسان کو نزل کا صلہ مانتے ہیں۔یہ کتاب الانذار ہےاورفصیح زبان میں ہے۔[**الاولین**] **الامم الاولین، خاصة** ،یہود[زبور]صحیفہ زبر، جتنے انبیاء آئے ہیں ان سب میں اس کی پیشنگوئی موجود ہےاور باتیں بھی ملتی جلتی ہیں۔(آیت ۱۹۷) تم معجزہ کیوں چاہتے

ہو۔جب کہ اس قرآن کو علماء یہود جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ہماری کتاب میں اسکی بشارت موجود ہے۔یہ کتاب تو حسی معجزہ ہے۔یہ مشرکین مکہ کے لئے معجزہ ہے۔اور علماء یہود اس کی گواہی دے رہے ہیں۔اور ۱۲ علماء یہود ایمان لائے۔(آیت ۱۹۸) اب اسماعیلی خاندان میں کوئی بھی نبی نہیں آیا ہے۔اب تک جتنے پیغبر آئے ہیں سب کے سب عجمیوں میں آئے ہیں، یہ تو عربی نبی ہیں۔(آیت ۱۹۹) اگر اعجمی ہوتا ہے تو اس کو کہتے کہ یہ تو عجمی ہے ہمیں تو عربی نبی کی ضرورت ہے۔[**لو نزلناه علی بعض الاعجمین**] **ما کانو ابه مؤمنین**]

(آیت ۲۰۰)[**به**] مراد قرآن،ان کے انکار اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے دلوں میں انکار ڈال دیا ہے۔گویا یہ انکار سانپ بن کر چلتا ہے، کانٹا بن کر چلتا ہے اس طرح وہ نہیں سنتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں۔[ابن عباس،حسن اور مجاہد کہتے ہیں:**ادخلنا الشرک و التکذیب**]اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو سوچتے ہیں اور غور کرتے ہیں تو یہ قرآن شفاء بن کر ان کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔(آیت ۲۰۲) جس چیز کا انذار کیا جا رہا ہے جب وہ آجائے گا اس وقت وہ ایمان لائیں گے۔اور آئے گا تو اچانک آجائے گا اور وہ اس سے غافل ہیں اور جب غفلت میں آئے گا تو'' **یا ویلتا** '' کہہ کر رہ جائیں گے۔(آیت ۲۰۳) ذرا سی مہلت مل جائے تو پکے مومن بن جائیں۔(آیت ۲۰۴) ہمارے عذاب کے بارے میں جلدی مچاتے ہیں۔ان کی شامت تو دیکھو کی عذاب کا استعجال کر رہے ہیں۔انذار ہو رہا ہے۔اس لئے فضل بہت زیادہ ہو رہا ہے۔(آیت ۲۰۵) ہم نے ان کو مہلت دے رکھی ہے لیکن اس کو غنیمت نہیں سمجھ رہے ہیں۔

(آیت ۲۰۸) [**قریة**]قوم اور علاقہ،جن کے ہاتھ میں وسائل ہوتا ہے۔[**الا و لها**]حال ہے یا **قریة** کی صفت ہے۔[**ذکری**]' **هذه ذکری**، یہ تذکیر ہے۔(آیت ۲۰۹)]**ظالمین**]انذار پورا کر رہا ہے۔ جب عذاب آئے گا اس وقت رسول اتمام حجت کرلے گا اس صورت ہم ظالم نہیں ہوں گے۔[**ذکری**]اسم مصدر،ذکر۔[**منذرون**] سے مراد **مذکرون**، بدل ہے۔

(آیت ۲۱۰) کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن شیاطین کی طرف سے آتا ہے اس کا جواب ہے کہ نہیں کہ اس قرآن کو شیاطین نہیں لائے،(آیت ۲۱۱) اور ان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس طرح کی چیزیں لائیں۔[**وما یسطیعون ان ینزلوا بهذا القرآن**]. (آیت ۱۱۲) وہ سننے سے محروم کر دیے گئے۔
یہ شیطانی وحی نہیں ہے اور اس میں توحید ہے اور اللہ نے بھیجا ہے۔(آیت ۲۱۳) تو تم بھی اللہ کے ساتھ

کسی کوشریک نہ کرو، مشرکین کی طرف اوران کے عقائد کی طرف نہ جھکو۔[عشیــرۃ]خاندان ۔یہی لوگ جو مخالفت کی قیادت کرر ہے ہیں ۔(آیت ۲۱۵)[خفض جناح]ان کو اپنی سر پرستی میں لیجیےاور یہی لوگ سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں،ان کی تربیت کریں،انھیں تعلیم دیں۔

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: ’’اس کے دومطلب ہوسکتے ہیں۔ایک یہ کہ تمہارے رشتہ داروں میں سے جو لوگ ایمان لا کرتمہاری پیروی اختیار کریں،ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت اورتواضع کا رویہ اختیار کرواور جو تمہاری بات نہ مانیں ان سے اعلان براءت کرو۔دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ارشادصرف ان رشتہ داروں سے متعلق نہ ہوجنہیں متنبہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ سب کے لیے عام ہے۔یعنی جوبھی ایمان لا کر تمہارا اتباع کرے اس کے ساتھ تواضع برتو اور جوبھی تمہاری نافرمانی سے اس کوخبردار کردو کہ اعمال سے میں بری الذمہ ہوں۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہےاس وقت قریش اورآس پاس کے اہل عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جورسول اللہ صلی علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہو گئے تھےمگر انھوں نے عملاً آپ کی پیروی اختیار نہ کی تھی، بلکہ وہ بدستوراپنی گمراہ سوسائیٹی میں مل جل کراسی طرح زندگی بسر کرر ہے تھے جیسی دوسرے کفار کی تھی۔ اللہ تعالی نے اس قسم کے ماننے والوں کوان اہل ایمان سے الگ قرار دیا جنھوں نے حضور کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپ کا اتباع بھی اختیار کرلیا تھا۔تواضع برتنے کا حکم صرف اسی مؤخرگروہ کے لئے تھا۔باقی رہے وہ لوگ جوحضورؐ کی فرمانبرداری سے منہ موڑے ہوئے تھے،جن میں آپ کی صداقت کو ماننے والے بھی شامل تھے اور آپ کا انکارکرنے والے بھی،ان کے متعلق حضورؐ کو ہدایت کی گئی کہ ان سے بےتعلقی کا اظہار کردواور صاف صاف کہہ دواپنے اعمال کا نتیجہ تم خودبھگتو گے۔تمہیں خبردار کردینے کے بعداب مجھ پر تمہارے کسی فعل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔(تفہیم القرآن جلد۳ حاشیہ ۱۳۶)

[من] تبعیض](آیت ۲۱۶) [عصوا] عشیرتک الاقربین ۔اگرانذار سے فائدہ نہ اٹھائیں تو آپ اعلان کر دیجیے کہ ہم ان سے بری ہیں، اس سے کام کوئی تعلق نہیں ہے،تم اس سے عذاب میں پڑ جاؤ گے۔[عزیز] الذی یحکم بما یرید، فعال ما یرید،اس کی طاقت کوچیلنج کرنے والا کوئی دوسری طاقت نہیں۔[حین تقوم]تہجد کے وقت اٹھتے ہیں۔(آیت ۲۱۹) [تقلبک]تبلیغی سرگرمی۔جوساجدین کے ساتھ مل کودعوتی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں اور یہ دن کے احوال کا ذکر ہے۔[فی الساجدین] مع الساجدین، المؤمنین۔ دعوتی سرگرمی۔وہ عزیز ورحیم ہے وہ دیکھتا ہے ہر چیز کوتو تم کو کیسے چھوڑ دے گا۔

موجودہ صورتحال کیسے باقی رہے گی، وہ ضرور بدلے گا۔[**سمیع**]وہ سن لیتا ہے، کہیں سے کوئی بندہ پکارتا ہے وہ حامی وناصر ہے۔**بصیر بما تعملون۔**

(آیت۲۲۱) پھراعتراض کا جواب دیا جارہا ہے[**کم**] مخالفین۔شیاطین کن لوگوں پراتر کرتے ہیں تم نہیں جانتے ہو، یہ کاہن لوگوں پراترتا ہے۔[**افاک**] **کذاب**[**اثیم**] فاجر، بدکار۔کاہنوں پراترتا ہے، نبی اس سے پاک ہے۔تم کبھی بھی نبی کواس میں کبھی گرفتار نہیں پاؤ گےاور تم کہتے ہو کہ شیطان اتر رہا ہے۔کیسے اترتے ہیں تم خود اپنی سوسائیٹی میں دیکھ لو۔[**یلقون**] سے مراد شیاطین ہیں۔

(آیت)۲۲۷۔۲۲۴)ان کے شاعر ہونے کا جواب دیا جارہا ہے۔اس قرآن کو کہتے تھے کہ یہ ساحر کا کلام ہے،اس لیے اپنے کلام کے ذریعہ دلوں کوموہ لیتا ہے۔انھیں بتایا جارہا ہے کہ تم لوگوں نے اپنے یہاں شعراءکونہیں دیکھا ہے،ان کی اتباع اوباش لوگ کرتے ہیں۔اور یہ شعراءایسے ہی صفات کے لوگ ہوتے ہیں جوانکی اتباع اوباش لوگ کرتے ہیں تو کیا محمد کے پاس ان ہی صفات کے لوگ اردگرد جمع ہو گئے ہیں کیا یہ شاعری کی خصوصیت ہے،نہیں دراصل شعر کی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کی اتباع نیک لوگ کرتے ہیں۔چوں کہ وہ ایمان لے آئے،تقوی اور عمل صالح سے مزین ہو گئے،اس لیے ان کی شاعری ایمان وتقوی سے لبریز ہے۔

(آیت۲۲۵) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں[**هام، یھیم**] بھٹکنا،اس وادی میں جاتے ہیں اوراس وادی میں اوران کا حال یہ ہے کہ اس قبیلے میں جاتے ہیں اوراس کبھی قبیلے میں،تو نبی بھی ایسا کرتا ہے۔(آیت۲۲۶) کیا شاعر ایسا ہی ہوتا ہے، یہ تردید ان کی شاعری کی ہے، یہ شعراء ہیں کہ جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ (آیت۲۲۷)[**الا**] عاطفہ یازائدہ۔[**انتصروا**] سنبھلتے رہے، بہت ظلم کے بعد سنبھلتے رہے۔[**انقلب**] کیا ہوگا،عنقریب جان جائیں گے۔[**منقلب**] انجام۔[**ظلموا**] جولوگ ایمان نہیں لائے۔

حواشی ومراجع:

۱۔ تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم الجزء الثانی سورۃ الشعراء آیت۴

۲۔ تدبر قرآن ۵سورۃ الشعراء آیت۴

۳۔ اذاً حرف جواب ہےاوراس کے کئی استعمالات ہیں:(۱) تاکید کے لئے آتا ہے۔(۲)فعل ماضی کے ساتھ آئے تو شرط کے معنی کے دیتا ہے۔(۳) مستقبل کا معنی شرط کے ساتھ دیتا ہے۔(موسوعۃ النحو والصرف و الاعراب۔اعدادالدکتور امثل بدیع یعقوب)

۴۔ ان دونوں آیتوں کے درمیان میں جوفرق ہےاس کی توضیح اوراسرار ورموز پر دکتور فاضل سامرائی جو۱۹۳۳ء

میں عراق کے ایک پرانے شہر سامراء میں پیدا ہوئے، گفتگو کرتے ہیں۔ دکتور فاضل سامرائی کا قرآنی منہج یہ ہے کہ قرآن کے معانی میں بہت جدت پیدا کرتے ہیں علم نحو کے ماہر ہیں قرآن کے معانی بیان کرتے ہوئے الفاظ قرآن پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔اور اعجاز قرآن کے بارے میں لفظی نکات اور اس کی بلاغت اور نحوی نکات پر دلنشین گفتگو کرتے ہیں اور اسی طرح قرآن مجید کے اندر اور بھی مختلف قسم کے نکات پیدا کرتے ہیں۔

سورہ شعراء ۴۲ آیت کے تحت اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سورہ اعرف میں موسیٰؑ اور فرعون سے متعلق آیتیں ۱۰۳ سے ۱۲۶ تک ہیں اور سورہ شعراء میں ۱۰ آیت سے ۵۱ تک آیتیں ہیں۔اوران آیتوں میں قصہ کی توجیہ اوراس کی باریکیاں اس طرح بیان کرتے ہیں۔سورہ اعراف میں موسیٰؑ کا قصہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے موسیٰؑ کی زندگی سے لیکر فرعون کے خاتمہ تک۔اور بنی اسرائیل کے بارے میں لمبی گفتگو ہوئی ہے۔لیکن سورہ شعراء میں ان کے قصہ کا اس حصہ پر محیط ہے جس میں فرعون سے مقابلہ ہوتا ہے اور میدان میں چیلنج ہوتا ہے پھر فرعون کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔اور دونوں سورتوں میں قصہ بیان کرنے میں یکسانیت ہے اور واقعہ کی تعبیر میں ایسے الفاظ سے ہوئے ہیں جو واقعات سے مناسب حال ہیں۔لیکن وہ کہتے ہیں کہ سورہ شعراء میں موسی اور فرعون کے درمیاں جو مقابلہ اور چیلنج ہوا اس کی تفصیل اس سورہ میں زیادہ ہے۔اور سورہ اعراف میں موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان براہ راست فرعون سے گفتگو نہیں ہے بلکہ ملأ سے گفتگو کا ذکر ہے اور سورہ شعراء میں موسیٰؑ کا فرعون سے براہ راست گفتگو کا ذکر ہے۔پھر ان دونوں آیتوں میں تطبیق دیتے ہیں۔مزید کہتے ہیں۔

سورہ اعراف میں قائلون **ملأ** (قوم کے سردار یا اعیان سلطنت) ہیں اور سورہ شعراء میں قائل فرعون ہے اور یہ اس وقت ہوا جب فرعون موسیٰؑ سے آرگومنٹ ہوتا ہے اور یہ **بسحرہ** (**یرید ان یخرجکم من ارضکم بسحرہ**) پر آکر ڈسکشن ختم ہو جاتا ہے۔گویا سورہ اعراف میں اجمال ہے اور شعراء میں تفصیل ہے۔اور اس طرح شعراء میں حق و باطل کی کشمکش کو پوری قوت کے پیش کیا گیا ہے۔وہ اپنے اس موقف کو اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ سورہ اعراف میں لفظ **ساحر** استعمال ہوا ہے لیکن سورہ شعراء میں **سحّار** کا لفظ استعمال ہوا جو مبالغہ ہے ایسا اس لئے تاکہ مقابلہ اور حق و باطل کی کشمکش کی شدت کو زیادہ سے آشکار کیا جا سکے۔اسی طرح **سحر** کا کلمہ سورہ اعراف میں سات مرتبہ استعمال ہوا ہے اور سور شعراء میں دس مرتبہ استعمال ہوا حالاں کہ سورہ اعراف سورہ شعراء سے لمبی سورہ ہے۔

مزید اس طرح لفظی بلاغت بیان کرتے ہیں کہ سورہ شعراء میں ''بعث'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور سورہ اعراف میں ''ارسل'' کا لفظ استعمال ہوا۔اور **بعث** میں ہیجان اور اقدام کا معنی اور مفہوم ہے جو **ارسل** کے معنی میں نہیں ہے **بعث** میں چیلنج پایا جاتا ہے، **بعث** میں انھاض کا مفہوم ہے، آگے بڑھنا، ایسی صورتحال پیدا کرنا کہ بیداری پیدا ہو، دراصل اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ دیہاتوں اور شہروں میں جائیں اور سب ساحروں کو جمع

کر کے موسیٰ کا مقابلہ کریں گویا اس سورہ میں اعراف کی وضاحت ہے۔

[قالوا لفرعون] میں ساحروں کا خطاب فرعون سے ہے جو شعراء میں ہے اور یہ سورہ اعراف میں نہیں ہے ایسا اس لئے ہے کہ چیلنج اور مقابلہ جو فرعون اور موسیٰ درمیان میں ہوا اس کو مھتم بالشان، بڑا اور سخت اس سورہ میں دکھانا مقصود ہے اور [أئن لنا لأجراً] کہہ کر اس میں مزید تاکید پیدا کر دی جاتی ہے۔اسی طرح [اذاً] کو ڈاکٹر سامرائی اسے حرف جواب اور جزاء مانتے ہیں۔ڈاکٹر سامرائی، موسیٰ کے قصہ کے ہر پہلو کو جو اعراف میں بیان ہوا ہے سورہ شعراء کو اس کی تفصیل اور توضیح گردانتے ہیں۔(موقع روائع البیان القرآنی)

امام فراہیؒ کی سورہ مرسلات کی تفسیر میں ترجیع اور تکرار کے موضوع پر بہت ہی اہم گوشوں پر باتیں موجود ہیں جو 'ویل للمذبین' کے تحت لکھی گئی ہیں۔لفظ 'ویل' کے مختلف پہلو گنائے ہیں، ''ویل'' کے بار بار تکرار کا فائدہ اور اس کے اسباب پر گفتگو کی ہے۔اور 'ویل' کو سورہ کے نظم کے اعتبار سے غور کیا ہے اور ''ویل'' کے ایک لفظ نے عذاب کی تمام اقسام کو سمیٹ لیا ہے۔(تفسیر سورہ مرسلات امام فراہیؒ)

اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کہتے ہیں کہ قرآن میں تکرار مضامین عمود اور موضوع کے اعتبار سے ہے اور انبیاء کی تاریخ دعوت مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہے سب کے مضامین بدل بدل کر بیان ہوئے ہیں وہ لکھتے ہیں'' قرآن میں انبیاء اور اقوام کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں وہ مختلف سورتوں میں، سورتوں کے عمود و مضمون کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان ہوئی ہیں، ہر سورہ میں سورہ میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ زیر بحث آیا ہے جتنے کے لیے سورہ کا مزاج مقتضی ہوا ہے، یہ سورہ (اعراف) صرف انبیاء کے مکذبین کے انجام کو ظاہر کر رہی ہے، اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا صرف وہی حصہ نمایاں ہوا ہے جو سورہ کے موضوع کو اجاگر کرنے والا ہے، اس کے بقیہ اجزاء دسوری سورتوں میں اپنے اپنے مواقع کی مناسبت سے آئے ہیں۔چنانچہ دوسری سورتوں میں خشیت اور تذکر کی اس دعوت کا ذکر بھی ذکر ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی عام سنت کے مطابق حضرت موسیٰ نے فرعون کو دی اور توحید و معاد سے متعلق اس مناظرے کا بھی جو فرعون اور حضرت موسیٰ کے درمیان ہوا۔ (تدبر قرآن سورہ اعراف جلد۳ آیت ۱۰۴۔۱۰۵)

اسی طرح 'تکرار مضامین کے موضوع پر قرآن میں تکرار کی اہمیت اور ضرورت پر' مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی کتاب ''قرآن مجید کا تعارف'' میں موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ تکرار محض کہیں بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر مقام پر تذکیر و تفہیم کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو پیدا کرتا ہے، مثلاً ایک ہی قصے کو اجمال و تفصیل کی مختلف حدوں میں بیان کرتا ہے، واقعات کی ترتیب اور بیان کے طرز میں تنوع پیدا کر دیتا ہے الفاظ کو بدل دیتا ہے۔قصے کے مختلف اجزاء میں سے کسی کو کہیں اور کسی کو کہیں حذف کر دیتا ہے۔ان باتوں سے جہاں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کو ایک ہی عبارت اور اور ایک ہی اسلوب میں سنتے سنتے طبیعتوں میں ناگواری نہیں محسوس ہوتی، جی اکتا اور کان تھک نہیں

جاتے، وہاں اس سے بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تذکیر یا استدلال کے پہلو بدل جاتے ہیں اور حکمت الٰہی کے کچھ نئے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں، جس سے سننے سمجھنے والوں پر ہر بار ایک نیا اثر مرتب ہوتا ہے اس طرح قصوں کی یہ تکرار، تکرار ہے بھی اور نہیں بھی۔ اسی پر احکام کی تکرار دلائل کی تکرار، نصائح کی تکرار اور دوسرے مضامین کی تکرار کو بھی قیاس کر لیجیے۔ یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ ایک ایک مضمون کو سو سو رنگ سے باندھا گیا ہے بلکہ ان میں سو سو حکمتیں اور دعوتی افادتیں بھی سمودی گئیں۔ (قرآن مجید کا تعارف۔ مولانا صدالدرین اصلاحیؒ)

اسی ضمن میں مولانا ابواللیث اصلاحی وندوی کا مقالہ ''قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم وشیطان'' بہت ہی فکر انگیز ہے۔ انھوں نے پورے قرآن میں جہاں آدم اور شیطان کا ذکر ہوا اس کا احاطہ کیا ہے اور دعوی کیا ہے کہ قصے بار بار سات سورتوں میں ہوئے ہیں، ہر جگہ نئی غرض کے لیے ہیں۔ اور ہر سورہ میں قصہ کا اصلی مقصد ذکر الگ الگ یوں بیان ہوا ہے۔ سورہ بقرہ میں اثبات نبوت وخلافت، سورہ اعراف میں بیان تکریم آدم بسلسلہ ذکر انعامات برائے دعوت شکر، سورہ حجر میں اثبات معاد، سورہ اسراء میں طغیان کا انجام، سورہ کہف میں شیطان کی عداوت، سورہ طٰہ میں عزم انسانی کا ضعف، اور سورہ ص میں ثبوت قیامت ضمناً مشرکین کے تکبر پر تعرض۔ (قرآنی مقالات، ادارہ علوم القرآن، سرسید نگر، علی گڑھ)

اور مولانا مودودیؒ کا تکرار مضامین میں اسلوب۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم آیتوں کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، قرآن کبھی اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے پھر ان ہی باتوں کو دوسری جگہ تفصیل سے بیان کرتا ہے، چاہے احکام ہوں، جس میں پوری شریعت شامل ہے ظاہر ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور دیگر عبادات سب ایک ہی موقع پر بیان نہیں کر دیئے گئے تھے، جیسے جیسے حالات پیش آتے گئے احکام تدریج کے ساتھ اترتے رہے، یہ خصوصیت احکام ہی کو حاصل نہیں ہے بلکہ نبیوں کے حالات، ان کی دعوتی تاریخ، سب ایک موقع پر نہیں بیان کر دیے گئے بلکہ مکی اور مدنی سورتوں مین دعوت کے حالات کے لحاظ سے جن جن امور اور پہلوؤں کی ضرورت پڑتی گئی بتدریج ان کا نزول ہوتا رہا اس طرح کے تمام موضوعات قرآنی جو قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں مولانا مودودی نے موقع ومحل کے لحاظ سے ان کو جمع اور بیان کر دیا ہے کبھی انہیں مولانا انہیں نظائر، تقابل، تشریح، اور ان جیسے الفاظ کے ذریعہ مختلف موضوعات اور عناوین کا ذکر قرآن پڑھنے والے کے لیے استفادہ کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ قرآن پر ان کے گہرے تدبر اور عمیق غور وفکر کے نتیجہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ آیئے ان نظائر پر نگاہ ڈالتے ہیں جنہیں مولانا نے اپنی تفسیر کے دوران جمع کر دیا ہے۔ مولانا کا اسلوب یہ ہے کہ وہ تفسیر کرنے کے وقت جن مماثل آیات کی تفسیر گزر چکی ہوتی ہے انہیں اس آیت کی تفسیر کے وقت وہ ان حوالوں کا ذکر کرتے ہیں تا کہ اس مفہوم سے متعلقہ آیات کی تشریح قاری پڑھ کر پورے مفہوم سے بیک نظر اس کے ذہن میں بیٹھالے۔

ان کی چند مثالیں جیسے:

موسیٰؑ کے قصہ اور اسکی تفصیلات : سورہ بقرہ جلد اول حواشی ۶۴ تا ۷۶ ، النساء حاشیہ ۲۰۱، المائدہ، حاشیہ ۴۲ ، اعراف ۹۳ تا ۱۱۹ ، یونس حواشی ۲۔۹۴ ، ہود، حواشی ۱۹۔۱۰۴۔ ۱۱۱ ، یوسف ، دیباچہ، ابراہیم حواشی ۸ تا ۱۳ ، بنی اسرائیل، حواشی ۱۱۳ تا ۱۱۷ ، جلد سوم، الکہف حواشی ۵۷ تا ۵۹ ، مریم، حواشی ۲۹ تا ۳۱ طہ، دیباچہ، حواشی ۵ تا ۵۷ ، المومنوں، حواشی ۲۹ ۔۴۲ ، الشعراء، حواشی ۷ تا ۴۹ ، النحل، حواشی ۸ تا ۱۷ ، القصص دیباچہ، حواشہ ۱ تا ۵۷ ، جلد چہارم، احزاب، ۱۱ ئے ۶۹ ، الصافات، آیات ۱۲۲۱۱۴ (سورہ مومن حاشیہ ۳۵)

حضرت موسیٰ فی الواقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے: تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم اعراف حواشی ۸۶ تا ۸۹ جلد سوم سورہ طہ حواشی ۲۹ تا ۵۳، الشعراء حواشی ۲۲ تا النمل حاشیہ ۱۶، سورہ امومن ۲ حاشیہ ۳۷۔

عشی کا لفظ زوال آفتاب سے رات کے ابتدائی حصے تک جس میں ظہر سے عشاء تک کی چار نماز: مزید تفصیل البقرہ اول حواشی ۵۔۵۹۔۶۰۔۲۶۳، ہود جلد دوم حاشیہ ۱۱۳، الحجر، حاشیہ ۵۳، بنی اسرائیل، دیباچہ، حواشی ۱۔۹۱ تا ۹۸، جلد سوم، طہ، حاشیہ ۱۱۱، النور، حواشی ۸۴ تا ۸۹، العنکبوت، حواشی ۶ ، تا ۹۷، الروم، حواشی ۲۴۔۵۰، سورہ مومن جلد ۲ حاشیہ ۴۷۔

ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے: مزید تشریح کے لیے ملاحظہ تفہیم القرآن جلد اول آل عمران حاشیہ ۵۳، النساء، حاشیہ ۱، انعام، حاشیہ ۶۳، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۰۔۱۴۵، الحجر حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۵، المومنون، حواشی ۱۲۔۱۳، سورہ السجدہ ۴ حاشیہ ۱۴۔

انسان کو اللہ کی حکمت اسے حکمت اور دانائیاور اختیار ملا ہے: مزید تفصیل تفہیم القرآن جلد دوم حواشی ۱۷۔۱۹، سورہ السجدہ دوم حاشیہ ۱۶۔

روح نکالتے وقت فرشتوں کا عملہ اور انکا برتاؤ مومن روح اور مجرم روح کے ساتھ: مزید تفصیل سورہ نساء، آیت ۹۷، انعام ۹۳۔ النحل ۲۸۔ الواقعہ، ۸۳۔۹۴، سورہ السجدہ ۴ حاشیہ ۲۱۔

حضرت عیسیٰؑ۔اسلامی تعلیمات کے تناظر میں (دوسری و آخری قسط)

ڈاکٹر رضوان الحق فلاحی

کیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام یہودی یا نصرانی تھے؟

یہ کہنا کہ یہودی یا نصرانی ہی جنت میں جائیں گے، یا یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت یاب ہو گے، یا ہم اللہ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ پر الزام ہے:

''یا پھر کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اور اولادِ یعقوبؑ سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو، تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا، جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے؟ تمہاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے۔''(۶۱)

''ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔''(۶۲)

نصاریٰ، مومنین (اور ایمان)

نصاریٰ مومنین کے قریبی (محبت کرنے والے) ہیں:

''تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدّنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔''(۶۳)

دونوں کے درمیان قدرِ مشترک (کلمۂ سواء)

''کہو، اے اہل کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے

کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔''(٦٤)

اگر آپس میں معاملہ نہ طے ہو سکے،تو...:

(آیتِ مباہلہ) ''یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمد! اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔''(٦٥)

نیک عیسائی کا عمل اور ان کے بارے میں اللہ کا وعدہ

''جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔وہ بول اٹھتے ہیں کہ ''پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے''۔اور وہ کہتے ہیں کہ ''آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جبکہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟'' ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔یہ جزاء ہے نیک رویّہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔''(٦٦)

اہلِ ایمان اہلِ کتاب کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ دوہرا اجر عطا فرمائیں گے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ، اللہ تمھیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمھیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے، اور تمہارے قصور معاف کر دے گا، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔(تم کو یہ روش اختیار کرنی چاہیئے) تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا کوئی اجارہ نہیں ہے، اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور وہ بڑے فضل والا ہے۔''(٦٧)

کتبِ احادیث میں بھی یہ ترغیب بار بار آئی ہے

''وہ شخص جو پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، پھر مجھ پر ایمان لایا تو اسے بھی دوگنا ثواب ملتا ہے....''(٦٨)

''...اور وہ اہل کتاب آدمی جو پہلے حضرت عیسی علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان

لایا اور پھر محمد (ﷺ) کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لایا، اس کے لیے بھی دواجر ہیں۔''(۶۹)

اہلِ کتاب جو حضرت محمدﷺ کی شریعت پر ایمان نہ لائے، اس کے لئے کھلی ہوئی وعید بھی ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد صلیﷺ کی جان ہے، اس امت کے جس یہودی اور عیسائی نے میرے متعلق سن لیا اور پھر وہ مجھ پر اتارے گئے دین وشریعت پر ایمان لائے بغیر فوت ہو جائے تو وہ جہنمی ہے۔''(۷۰)

عیسائیوں سے متعلق اللہ کا فیصلہ

نصارٰی سے ہم نے میثاق لیا تو وہ بھول گئے۔ پھر ہم (سزاء) ان کے اندر عداوت اور بغضاء ڈال دیا:

''اِسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم ''نصارٰی'' ہیں، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصّہ انہوں نے فراموش کر دیا، آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور آپس کے بغض وعناد کا بیج بو دیا، اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔''(۷۱)

اہلِ کتاب کا ایک گروہ بھٹکانا چاہتا ہے:

''اللہ صرف انہی کا حامی ومددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔ اے ایمان لانے والو! اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''(۷۲)

بنی اسرائیل کو حضرت داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی:

''... اور ان پر داود اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت بھیجی، اور ایسا اس وجہ سے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور مقررہ حدود سے آگے بڑھ جاتے تھے....''(۷۳)

رہبانیت بدعت ہے

بسا اوقات ترکِ دنیا کو نیکی سمجھ لیا جاتا ہے۔ مجاہدہ اور جسم کو بلاوجہ مشقت میں ڈالنے کو کارِثواب جانا جاتا ہے۔ اسلام اس تصور کی نفی کرتا ہے۔ مذہبِ عیسائیت میں بوجوہ یہ تصور سرایت کر گیا۔ قرآن اس کو صاف کرتا ہے، اور حدیث میں اس کی ابتداء کی وجہ پر روشنی پڑتی ہے:

''ان کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے، اور ان سب کے بعد عیسی ابن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں

میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا،مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا،مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔''(۴۷)

عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بعد کچھ ایسے بادشاہ ہوئے جنہوں نے تورات وانجیل کو بدل دیا اور ان میں کچھ ایمان پر قائم رہے۔وہ (اصل) تورات پڑھتے تھے۔ان بادشاہوں سے کہا گیا: ہم کوئی گالی اس گالی سے سخت نہیں پاتے جو یہ ہمیں دیتے ہیں کیونکہ یہ پڑھتے ہیں:''جو شخص اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے، وہ کافر ہے۔'' اور اس قسم کی دوسری آیات، نیز وہ اپنی قرائت میں ہم پر عملی عیب بھی لگاتے ہیں۔ان کو بلائیں اور انہیں کہیں کہ جس طرح ہم پڑھتے ہیں، وہ بھی اسی طرح پڑھیں اور وہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح ہمارا ایمان ہے۔بادشاہ نے ان کو بلایا اور ان کو قتل کی دھمکی دی الاَّ یہ کہ وہ تورات وانجیل کی صحیح قرائت چھوڑ کر ان کی طرح تبدیل شدہ قرائت کریں۔ان (مومن) لوگوں نے کہا: تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ تم ہمیں چھوڑ دو۔ان میں سے ایک گروہ نے کہا: تم ہمارے لیے کوئی بلند عمارت بنا دو۔پھر ہمیں اس پر چڑھا دو۔ہمیں کوئی ایسی چیز دو کہ ہم اپنا کھانا پینا اوپر لے جاسکیں۔ہم تمہارے پاس نہیں آئیں گے۔ایک گروہ نے کہا: ہمیں چھوڑ و۔ہم زمین میں گھومتے پھریں گے اور بلا وجہ چکر لگاتے رہیں گے اور جانوروں کی طرح کھاتے پیتے رہیں گے۔اگر تم ہمیں اپنے علاقے میں پکڑ لو تو بے شک ہمیں قتل کر دینا۔ایک اور گروہ نے کہا: ہمارے لیے صحراؤں میں گھر بنا دو۔ہم کنویں کھود لیں گے۔اور سبزیاں کاشت کریں گے۔نہ ہم تمہارے پاس آئیں گے، نہ تمہارے قریب سے گزریں گے۔ان قبائل میں سے کوئی قبیلہ بھی ایسا نہ تھا جس کا کوئی دوست اور رشتے داران (مومن) لوگوں میں نہ ہو اس لیے انہوں نے یہ باتیں مان لیں پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:''اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا،مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔'' اور کچھ دوسرے لوگ بھی کہنے لگے کہ ہم تو اس طرح عبادت کریں گے جیسے کہ فلاں (یہ اونچی عمارتوں والے) کرتے ہیں اور ہم بھی اسی طرح گھومتے پھریں

گے جیسے یہ گھومتے پھرتے ہیں۔اور ہم بھی آبادیوں سے دور جھونپڑیاں بنالیں گے جس طرح انہوں نے بنائی ہیں، حالانکہ یہ لوگ مشرک تھے اور ان کو ان لوگوں کے ایمان کا کوئی علم نہ تھا جن کی اقتدا کا وہ دم بھرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان میں سے بھی چند لوگ ہی رہ گئے تو مناروں والے (راہب لوگ) اپنے مناروں سے اتر آئے اور گھومنے پھرنے والے بھی واپس آ گئے اور جھونپڑیوں والے اپنی جھونپڑیوں سے لوٹ آئے۔اور یہ سب لوگ آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کی تصدیق کی۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔'' ایک اجر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تورات وانجیل پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان وتصدیق کا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور اللہ تعالیٰ تمہیں نور عطا فرمائے گا جس کی روشنی میں تم (راہ حق پر) چلو گے۔'' اس نور سے مراد قرآن مجید اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے۔اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ''تا کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) جان لیں، یعنی تمہاری مشابہت اختیار کریں (تمہاری طرح ایمان لے آئیں) کہ وہ بذات خود اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی فضل حاصل نہیں کر سکتے۔۔۔الخ۔''(۷۵)

حضرت عیسیٰؑ خود ہی سامانِ دنیا سے کنارہ کش رہتے

''اور جو شخص محض عاجزی وانکساری کی وجہ سے اپنے ہاتھ سے پانی پیتا ہے حالانکہ وہ برتن سے پینے کی استطاعت رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی انگلیوں کی تعداد کے برابر نیکیاں لکھتا ہے، یہی عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کا برتن تھا جب انہوں نے یہ کہہ کر پیالہ پھینک دیا: اف! یہ بھی دنیا کا سامان ہے۔''(۷۶)

قیامت کی دس نشانیوں میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول

یہ ایک مسلمہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اٹھالیا ہے اور قیامت سے قبل وہ ضرور تشریف لائینگے۔تمام اہلِ کتاب ان پر ایمان لائینگے۔وہ دجال کا خاتمہ فرمائینگے، یاجوج ماجوج سے امت کی حفاظت فرمائینگے اور ایک نظامِ عدل قائم کردینگے۔قرآن پاک میں اس بارے میں ہلکا سا اشارہ ہے۔پوری تفصیل احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہے:

''ہم رسول اللہ ﷺ کے کمرے کے زیرسایہ بیٹھے باتیں کررہے تھے، ہم نے قیامت کا ذکر

کیا تو ہماری آوازیں بلند ہوگئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اس وقت تک نہیں ہوگی، یا قائم نہیں ہوگی جب تک کہ اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہوجائیں: سورج کا پچھّم سے طلوع ہونا، دابہ (چوپایہ) کا ظہور، یاجوج وماجوج کا خروج، ظہور دجال، ظہور عیسیٰ بن مریم، ظہور دخان (دھواں) اور تین جگہوں: مغرب، مشرق اور جزیرہ عرب میں خسف (دھنسنا) اور سب سے آخر میں یمن کی طرف سے عدن کے گہرائی میں سے ایک آگ ظاہر ہوگی وہ ہانک کر لوگوں کو محشر کی طرف لے جائے گی۔''(۷۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی کیفیت (تفصیل) (۷۸)

حضرت عیسیٰؑ اور امام مہدی

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دن بہ دن معاملہ سخت ہوتا چلا جائے گا، اور دنیا تباہی کی طرف بڑھتی جائے گی، اور لوگ بخیل ہوتے جائیں گے، اور قیامت بدترین لوگوں پر ہی قائم ہوگی، اور مہدی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔''(۷۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی الگ الگ ہیں۔(۸۰)

نزول کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے کرنے کا کام:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! عنقریب تمہارے درمیان عیسیٰ بن مریم حاکم اور منصف بن کر اتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے، سور کو قتل کریں گے، جزیہ ختم کردیں گے، اور مال کی زیادتی اس طرح ہوجائے گی کہ اسے کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔''(۸۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بمقابلہ دجال

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ فرمایا کہ میں نے خواب میں ایک مرتبہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اپنے کو دیکھا، اس وقت مجھے ایک صاحب نظر آئے جو گندمی رنگ لٹکے ہوئے بال والے تھے، دو آدمیوں کے درمیان ان کا سہارا لیے ہوئے اور سر سے پانی صاف کررہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو فرشتوں نے جواب دیا کہ آپ ابن مریم علیہما السلام ہیں۔ اس پر میں نے انہیں غور سے دیکھا تو مجھے ایک اور شخص بھی دکھائی دیا جو سرخ، موٹا، سر کے بال مڑے ہوئے اور داہنی آنکھ سے کانا تھا، اس کی

آنکھ ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے اٹھا ہوا انار ہو، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ تو فرشتوں نے بتایا کہ یہ دجال ہے۔اس سے شکل وصورت میں ابن قطن بہت زیادہ مشابہ تھا۔زہری نے کہا کہ یہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا جو جاہلیت کے زمانہ میں مرگیا تھا۔''(۸۲)

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سانس کی خوشبو سے دجال نمک کی طرح پگھلے گا۔''(۸۳)

''دجال کو باب لُد کے پاس قتل کریں گے۔''(۸۴)

''تمام اہلِ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر موت سے قبل ایمان لائیں گے۔''(۸۵)

دجال اور یاجوج وماجوج کے بارے میں تفصیلات اوران کے مقابلے میں حضرت عیسیؑ کا کردار:

''ابوخیثمہ زہیر بن حرب اور محمد بن مہران رازی نے مجھے حدیث بیان کی۔الفاظ رازی کے ہیں۔کہا: ہمیں ولید بن مسلم نے حدیث بیان کی،انھوں نے کہا:ہمیں عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر نے یحییٰ بن جابر قاضی حمص سے انھوں نے عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر ہے۔انھوں نیا پنے والد جبیر بن نفیر سے اور انھوں نے حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی،انھوں نے کہا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح دجال کا ذکر کیا۔آپ نے اس (کے ذکر کے دوران) میں کبھی آواز دھیمی کی کبھی اونچی کی۔یہاں تک کہ ہمیں ایسے لگا جیسے وہ کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔جب شام کو ہم آپ کے پاس (دوبارہ) آئے تو آپ نے ہم میں اس (شدید تاثر) کو بھانپ لیا۔آپ نے ہم سے پوچھا''تم لوگوں کو کیا ہوا ہے؟'' ہم نے عرض کی ''اللہ کے رسول! صبح کے وقت آپ نے دجال کا ذکر فرمایا تو آپ کی آواز میں (ایسا) اتار چڑھاؤ تھا کہ ہم نے سمجھا کہ وہ کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے تم لوگوں (حاضرین) پر دجال کے علاوہ دیگر (جہنم کی طرف بلانے والوں) کا زیادہ خوف ہیا گر وہ نکلتا ہے اور میں تمھارے درمیان موجود ہوں تو تمھاری طرف سے اس کے خلاف (اس کی تکذیب کے لیے) دلائل دینے والا میں ہوں گا اور اگر وہ نکلا اور میں موجود نہ ہوا تو ہر آدمی اپنی طرف سے حجت قائم کرنے والا خود ہوگا اور اللہ ہر مسلمان پر میرا خلیفہ (خود نگہبان) ہوگا۔وہ گچھے دار بالوں والا ایک جوان شخص ہے اس کی ایک آنکھ بے نور ہے۔میں ایک طرح سے اس کو عبدالعزیٰ بن قطن سے تشبیہ دیتا ہوں تم میں سے جو اسے پائے تو اس کے سامنے سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے وہ عراق اور شام کے درمیان ایک رستے سے نکل کر آئے گا۔وہ دائیں طرف بھی تباہی مچانے والا ہوگا اور بائیں طرف بھی۔اے اللہ کے بندو! تم ثابت قدم رہنا۔ہم نے عرض کیا۔اللہ کے رسول! زمین میں اس کی سرعت رفتار کیا ہوگی؟ آپ نے فرمایا: بادل کی طرح جس کے پیچھے

ہوا ہو۔ وہ ایک قوم کے پاس آئے گا انھیں دعوت دے گا وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کی باتیں مانیں گے۔تو وہ آسمان (کے بادل) کو حکم دے گا۔ وہ بارش برسائے گا اور وہ زمین کو حکم دے گا تو وہ فصلیں اگا ئیگی۔ شام کے اوقات میں ان کے جانور (چراگاہوں سے) واپس آئیں گے تو ان کے کوہان سب سے زیادہ اونچیا ورتھن انتہائی زیادہ بھرے ہوئے اور کوکھیں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ پھر ایک (اور) قوم کے پاس آئے گا اور انھیں (بھی) دعوت دے گا۔ وہ اس کی بات ٹھکرادیں گے۔ وہ انھیں چھوڑ کر چلا جائے گا تو وہ قحط کا شکار ہو جائیں گے۔ان کے مال مویشی میں سے کوئی چیز ان کیہاتھ میں نہیں ہوگی۔ وہ (دجال) بنجر زمین میں سے گزرے گا تو اس سے کہیگا اپنے خزانے نکال تو اس (بنجر زمین) کے خزانے اس طرح (نکل کر) اس کے پیچھےلگ جائیں گے۔ جس طرح شہد کی مکھیوں کی رانیاں ہیں پھر وہ ایک بھر پور جوان کو بلائے گا اور اسے تلوار۔ مارکر (یکبارگی) دو حصوں میں تقسیم کر دے گا جیسے نشانہ بنایا جانے والا ہدف (یکدم ٹکڑے ہو گیا) ہو۔ پھر وہ اسے بلائے گا تو وہ (زندہ ہو کر) دیکھتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہنستا ہوا آئے گا۔ وہ (دجال) اسی عالم میں ہوگا جب اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم علیہما السلام کو معبوث فرمادے گا۔ وہ دمشق کے حصے میں ایک سفید مینار کے قریب دو کیسری کپڑوں میں دو فرشتوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو قطرے گریں گے۔ اور سر اٹھائیں گے تو اس سے چمکتے موتیوں کی طرح پانی کی بوندیں گریں گی۔ کسی کافر کے لیے جو آپ کی سانس کی خوشبو پائے گا مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اس کی سانس (کی خوشبو) وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر جائے گی۔ آپ علیہ السلام اسے ڈھونڈیں گے تو اسے لُد (Lyudia) کے دروازے پر پائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے پاس وہ لوگ آئیں گے جنھیں اللہ نے اس (دجال کیدام میں آنے) سے محفوظ رکھا ہوگا تو وہ اپنے ہاتھ ان کے چہروں پر پھیریں گے۔ اور انھیں جنت میں ان کے درجات کی خبر دیں گے۔ وہ اسی عالم میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیگا میں نے اپنے (پیدا کیے ہوئے) بندوں کو باہر نکال دیا ہے ان سے جنگ کرنے کی طاقت کسی میں نہیں۔ آپ میری بندگی کرنے والوں کو اکٹھا کر کے طور کی طرف لے جائیں اور اللہ یاجوج ماجوج کو بھیج دے گا، وہ ہر اونچی جگہ سے اُمڈتے ہوئے آئیں گے۔ ان کے پہلے لوگ (میٹھے پانی کی بہت بڑی جھیل) بحیرہ طبریہ سے گزریں گے اور اس میں جو (پانی) ہوگا اسے پی جائیں گے پھر آخری لوگ گزریں گے تو کہیں گے۔ کبھی اس (بحیرہ) میں (بھی) پانی ہوگا۔ اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی محصور ہو کر

رہ جائیں گے۔حتیٰ کہ ان میں سے کسی ایک کے لیے بیل کا سر اس سے بہتر (قیمتی) ہوگا جتنا آج تمھارے لیے سو دینار ہیں۔اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی گڑگڑا کر دعائیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان (یاجوج ماجوج) پر ان کی گردنوں میں کیڑوں کا عذاب نازل کر دے گا تو وہ ایک انسان کے مرنے کی طرح (یکبارگی) اس کا شکار ہو جائیں گے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اتر کر (میدانی) زمین پر آئیں گے تو انھیں زمین میں بالشت بھر بھی جگہ نہیں ملے گی، جو ان کی گندگی اور بدبو سے بھری ہوئی نہ ہو۔اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اللہ کے سامنے گڑگڑائیں گے تو اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کے جیسی لمبی گردنوں کی طرح (کی گردنوں والے) پرندے بھیجے گا جو انھیں اٹھائیں گے اور جہاں اللہ چاہے گا جا پھینکیں گے۔پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش بھیجے گا جس سے کوئی گھر اینٹوں کا ہو یا اون کا (خیمہ) اوٹ مہیا نہیں کر سکے گا۔وہ زمین کو دھو کر شیشے کی طرح (صاف) کر چھوڑ یگی۔پھر زمین سے کہا جائے گا، اپنے پھل اگاؤ اور اپنی برکت لوٹا لاؤ تو اس وقت ایک انار کو پوری جماعت کھائیگی اور اس کے چھلکے سے سایہ حاصل کرے گی اور دودھ میں (اتنی) برکت ڈالی جائے گی کہ اونٹنی کا ایک دفعہ کا دودھ لوگوں کی ایک بڑی جماعت کو کافی ہوگا اور گائے کا ایک دفعہ کا دودھ لوگوں کے قبیلے کو کافی ہوگا اور بکری کا ایک دفعہ کا دودھ قبیلے کی ایک شاخ کو کافی ہوگا۔وہ اسی عالم میں رہ رہے ہوں گے۔کہ اللہ تعالیٰ ایک عمدہ ہوا بھیجے گا وہ لوگوں کو ان کی بغلوں کے نیچے سے پکڑے گی۔اور ہر مومن اور ہر مسلمان کی روح قبض کر لے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے وہ وہ گدھوں کی طرح (برسرعام) آپس میں اختلاط کریں گے تو ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔"(۸۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نظر کا دھوکا ہو سکتا تھا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک بشر تھے اور انہیں سہو ہو سکتا تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث کے مطابق ان کی نظر کو دھوکا ہوا، جس کے بعد انہوں استغفار اور تجدیدِ ایمان کیا:

> "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا پھر اس سے دریافت فرمایا: تو نے چوری کی ہے؟ اس نے کہا ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور میری آنکھوں کو دھوکا ہوا۔"(۸۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو پانچ باتوں کا حکم دیا

ویسے تو انجیل اللہ کے احکام سے بھری ہے، مگر اس میں تحریف ہونے کی وجہ سے اصل تعلیمات گڈمل ہو کر رہ گئی ہیں۔ حدیث کی رو سے چند تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے:

''... انہوں نے کہا: اللہ نے ہمیں پانچ باتوں کا حکم دیا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تمہیں حکم دوں کہ تم بھی ان پر عمل کرو۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور اس شخص کی مثال جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس آدمی کی ہے جس نے ایک غلام خالص اپنے مال سے سونا یا چاندی دے کر خریدا، اور (اس سے) کہا: یہ میرا گھر ہے اور یہ میرا پیشہ (روزگار) ہے تو تم کام کرو اور منافع مجھے دو، سو وہ کام کرتا ہے اور نفع اپنے مالک کے سوا کسی اور کو دیتا ہے، تو بھلا کون شخص یہ پسند کر سکتا ہے کہ اس کا غلام اس قسم کا ہو، ۲- اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے تو جب تم نماز پڑھو تو ادھر ادھر نہ دیکھو۔ کیونکہ اللہ اپنا چہرہ نماز پڑھتے ہوئے بندے کے چہرے کی طرف رکھتا ہے جب تک کہ وہ ادھر ادھر نہ دیکھے، ۳- اور تمہیں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی مثال اس آدمی کی ہے جو ایک جماعت کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ ایک تھیلی ہے جس میں مشک ہے اور ہر ایک کو اس کی خوشبو بھاتی ہے۔ اور روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے بڑھ کر ہے، ۴- اور تمہیں صدقہ و زکاۃ دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جسے دشمن نے قیدی بنا لیا ہے اور اس کے ہاتھ اس کے گردن سے ملا کر باندھ دیئے ہیں، اور اسے لے کر چلے تا کہ اس کی گردن اڑا دیں تو اس (قیدی) نے کہا کہ میرے پاس تھوڑا زیادہ جو کچھ مال ہے میں تمہیں فدیہ دے کر اپنے کو چھڑا لینا چاہتا ہوں، پھر انہیں فدیہ دے کر اپنے کو آزاد کرا لیا۔ ۵- اور اس نے حکم دیا ہے کہ تم اللہ کا ذکر کرو۔ اس کی مثال اس آدمی کی مثال ہے جس کا پیچھا دشمن تیزی سے کرے اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں پہنچ کر اپنی جان کو ان (دشمنوں) سے بچا لے۔ ایسے ہی بندہ (انسان) اپنے کو شیطان (کے شر) سے اللہ کے ذکر کے بغیر نہیں بچا سکتا....''(۸۸)

تورات میں مذکور بعض دیگر حقائق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو کر مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آرام فرمائیں گے:

''تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال لکھے ہوئے ہیں اور یہ بھی کہ عیسیٰ بن مریم انہیں کے ساتھ دفن کئے جائیں گے۔ ابوقتیبہ کہتے ہیں کہ ابومودود نے کہا: حجرہ مبارک میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔''(۸۹)

''عیسیٰ بن مریمؑ زمین پر نازل ہوں گے، شادی کریں گے اوران کی اولاد ہوگی، وہ پینتالیس سال رہیں گے پھر فوت ہوجائیں گے۔ انہیں میری قبر کے ساتھ ہی میرے قریب دفن کردیا جائے گا۔ میں اور عیسیٰ بن مریم، ابوبکر وعمر کے درمیان سے ایک ہی قبر سے کھڑے ہوں گے۔''(۹۰)

''نجاشی نے کہا: تم کس بات پر ہنسے ہو؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کی کتاب سن کر ہنسے ہو؟ اللہ کی قسم! عیسیٰ بن مریم پر جو باتیں نازل کی گئی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب دنیا میں نوجوان حکمران ہوں گے تو زمین پر لعنت اترے گی۔''(۹۱)

جو جماعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ صف آرا ہوگی، وہ جہنم سے آزاد ہے

حضرت عیسیٰؑ کی سرپرستی میں قیامت سے قبل ایک آخری معرکہ بپا ہوگا۔ بشارت ہے ان لوگوں کے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے شریکِ جنگ ہوں گے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت میں سے دو جماعتوں کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے آزاد فرما دیا ہے: ایک وہ جماعت جو ہندوستان پر حملہ کرے گی اور دوسری وہ جماعت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ (مل کر دجال کے مقابلے میں صف آرا) ہوگی۔''(۹۲)

مختصر یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں رائج ہیں۔ پھر قیامت سے قبل ان کے ظہور کا انتظار رہے گا۔ میری یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح حقائق سامنے آئیں، تاکہ عام طور سے لوگ یقین کے ساتھ ان کے بارے میں گفتگو کرسکیں اور پیشین گوئی کے مطابق ان کی آمد کا انتظار کرسکیں، مسلم اور عیسائی انٹرفیتھ ڈائیلاگ کے ذریعہ ایک صحتمند معاشرہ وجود میں آسکے اور کریگ کونسیڈ ائنن کی پیش رفت کی حوصلہ افزائی ہوسکے۔

حواشی ومراجع

۶۱۔ بقرہ۱۴۰ ۶۲۔آل عمران ۶۷ ۶۳۔ مائدہ۸۲ ۶۴۔ آل عمران۶۴

۶۵۔ آل عمران۶۱ ۶۶۔مائدہ۸۵-۸۳ ۶۷۔ حدید۲۹-۲۸ ۶۸۔ بخاری۳۴۴۶

۶۹۔ مسند احمد۵۲۵۲ ۷۰۔ رواہ مسلم (مشکوۃ۱۰) ۷۱۔ مائدہ۱۴ ۷۲۔آل عمران ۶۹

۷۳۔ ترمذی ۳۰۴۷ضعیف (ضعیف، ابن ماجہ ۴۰۰۶، صحیح وضعیف سنن الترمذی الالبانی)، ابوداؤد ۴۳۳۶ ضعیف (ابوعبیدہ اوران کے والد ابن مسعود کے درمیان انقطاع ہے)، ابن ماجہ ۴۰۰۶

۷۴۔ حدید۲۷ ۷۵۔ نسائی۵۴۰۲

۷۶۔ ابن ماجہ۴۴۳۱ضعیف (سند میں بقیہ بن ولید مدلس ہیں اور روایت عنعنہ سے کی ہے، نیز مسلم بن عبداللہ مجہول راوی ہیں)

۷۷۔ مسلم ۸۸-۲۸۵۵۷، ابوداؤد۴۳۱۱، ابن ماجہ۴۰۵۵، مسند احمد ۱۲۸۴۶

۷۸۔ ملاحظہ ہو: ترمذی ۲۲۴۰، ابوداؤد ۴۳۲۱، ابن ماجہ ۴۰۷۷ضعیف (سند میں اسماعیل بن رافع ضعیف راوی ہیں، اورعبدالرحمٰن محاربی مدلس، اور روایت عنعنہ سے کی ہے، اور بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں ہیں۔)

۷۹۔ ابن ماجہ۴۰۳۹ ۸۰۔السلسلۃ۲۶۶۲ ۸۱۔ ترمذی۲۲۳۳، ابن ماجہ۴۰۷۸

۸۲۔ بخاری۳۴۴۱ ۸۳۔ مسلم ۷۲۷۸، ۷۳۷۳، ۷۳۸۱، ابوداؤد۴۳۲۴

۸۴۔ مسند احمد۱۳۰۱۱ ۸۵۔ مسند احمد۱۳۰۱۸

۸۶۔ مسلم ۷۳۷۳، ابن ماجہ ۴۰۷۵، ۴۰۷۷ ضعیف (سند میں اسماعیل بن رافع ضعیف راوی ہیں، اور عبدالرحمٰن محاربی مدلس، اور روایت عنعنہ سے کی ہے، اور بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں ہیں۔) ۴۰۸۱، مسند احمد ۱۳۰۱۲

۸۷۔ بخاری۳۴۴۴، مسلم ۶۱۳۷، نسائی ۵۴۲۹، ابن ماجہ ۲۱۰۲ ۸۸۔ ترمذی ۲۸۶۳

۸۹۔ ترمذی ۳۶۱۷، مشکوۃ ۵۷۷۲

۹۰۔ مشکوۃ ۵۵۰۸ضعیف فیہ عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم الافریقی ضعیف وفی السند الیہ نظر

۹۱۔ مسند احمد ۱۲۰۹۶ ۹۲۔ نسائی ۳۱۷۷، السلسلۃ ۳۵۱۶، مسند احمد ۱۲۴۷۵

مولانا عبدالسلام ندوی۔ چند معروضات

عبداللہ زکریا

مولانا عبدالسلام ندوی وہ یگانہ روزگار شخصیت ہے، جس پر کچھ لکھنے کے لیے علم کے ایک بحرِ ذخار کی ضرورت ہے اوراس راقمِ آثم کی تہی دامنی کا یہ عالم ہے کہ چند قطرے بھی میسر نہیں ہیں۔افسوس کہ وہ شخص، جس کی عبقریت کا اعتراف پوری علمی دنیا کو ہے، خود اس کے قریبی رشتہ دار نہ تو اس کا صحیح ادراک کر پائے اور نہ اس وراثت کے امین بن پائے۔ ویسے یہ بارِامانت اٹھانے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے، اتنا علم حاصل کر پانا ناممکنات میں سے ہے۔ اس لیے اس باب میں ان کو معافی مل سکتی ہے، لیکن عظمت کا ادراک نہ ہونا یقیناً افسوس کی بات ہے۔ مولانا کے سب سے لائق شاگرد کبیر احمد جائسی جو 'مکاتیبِ واشعار مولانا عبدالسلام ندوی' کے مرتب بھی ہیں، اس کا انتساب کرتے ہوئے اس طرح شکوہ کناں ہیں: ''مولانا عبدالسلام ندوی کے پڑپوتوں کے نام جو شاید ان کی عظمتوں کو محسوس کر سکیں۔''

اس سے بھی زیادہ افسوس اس کا ہے کہ دارالمصنفین، جس سے مولانا آخری سانس تک جڑے رہے، وہاں کے بعض اربابِ حل وعقد نے مولانا کے قد کو گھٹانے کی کوشش کی۔ اب یہ دانستہ تھی یا نادانستہ، اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ بات مرحومین کی ہے۔ میں ان پر کوئی تہمت نہیں لگا رہا ہوں بلکہ علی وجہ الشہادت دو اقتباسات نقل کر رہا ہوں۔ یہ شاہ معین الدین صاحب (جو ایک طویل مدت تک دار المصنفین کے منتظم اعلیٰ رہے) کے اس طویل مضمون کا حصہ ہے، جو انھوں نے مولانا کے بارے میں اپنی عقیدت اور خراجِ تحسین کے طور پر لکھا ہے۔ یہاں ان کی گوناگوں خصوصیتوں: جیسے استغنا، بے نیازی، درویشی، حسنِ اخلاق اور شہرت سے کوسوں دور بھاگنے کا تذکرہ تو ہے لیکن بات جہاں لکھنے پڑھنے کی آئی وہاں اس کی تصویر ایسی کھینچی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا ہے وہ لوگوں کو کیا دکھانا اور بتانا چاہ رہے ہیں۔ پہلا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ادب وانشاء میں وہ نہایت ممتاز تھے اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی۔ چمنستانِ ادب میں ان کا قلم بڑا اسبک خرام تھا۔ ذہن بڑا اخاذ پایا تھا۔ سرسری مطالعوں سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے اور عربی کی ہر اہم اور نئی کتاب سے وہ اپنے کام کی کچھ نہ کچھ

باتیں ضرور نکال لیتے تھے اور اس پر ایک مضمون تیار کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے بیش تر مضامین کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ ان سے مستقل تصنیف کا خاکہ تیار کر لیتے تھے۔ چنانچہ سیرت عمر بن عبدالعزیز کی تالیف میں انھوں نے اگر چہ بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے، لیکن اس کا ابتدائی خاکہ سیرت العمرین ابنِ جوزی سے ان کے ذہن میں آیا تھا۔ اسی میں رنگ بھر کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سیرت کا مرقع تیار کیا۔''

اس پیراگراف سے جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا اوریجنل تھنکر نہیں تھے، بلکہ ان کا ذہن بہت 'اخاذ' تھا اور ان کی بہت ساری کتابوں کا مواد دراصل پہلے لکھی گئی کتابوں سے برآمد کیا گیا ہے۔ مولانا کا کمال بس اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے تخیل سے ان میں رنگ بھر کر اس کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا۔ یہ اس شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس کی کتاب 'شعر الہند' اردو شعر و ادب پر معروضی تنقید کی اولین کتاب مانی جاتی ہے اور اقبال کو سمجھنے کے لیے آج بھی لوگ جس کی کتاب 'اقبال کامل' پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

خیر آگے بڑھتے ہیں اور اس کے آگے والا پیرا پڑھتے ہیں:

''لیکن طبیعت شاعرانہ و تخیل پرست تھی، اس لیے محنت و مشقت سے گھبراتے اور لکھنے کے لیے ایسے ہلکے پھلکے موضوع کا انتخاب کرتے تھے، جس میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہ ہو۔ اس کمی کو وہ ادبی حسن و لطافت سے پورا کر دیتے تھے، قلم اتنا پختہ اور منجھا ہوا تھا کہ قلم برداشت لکھتے تھے اور لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی اور حک و اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔''

جس شخص کو دنیا عبقری اور نہ جانے کیا کیا سمجھتی ہے، اس نے صرف ہلکے پھلکے موضوعات پر لکھنے کی زحمت گوارا کی ہے، کیوں کہ پِتّہ مار کام ان کے بس کا نہیں تھا۔ ہاں اتنا کمال ضرور دکھایا ہے کہ اس کمی کو اپنے زورِ قلم سے دور کر دیا ہے۔ مطلب مولانا کوئی بڑا علمی اور تحقیقی کام کر ہی نہیں سکتے تھے کہ ان کی 'طبعِ نازک' پر یہ بہت شاق گزرتا۔

خود مولانا نے اپنی طبیعت، ذوق، اپنے طبعی میلان اور لکھنے پڑھنے کے تعلق سے ایک مضمون 'میری محسن کتابیں' کے عنوان سے لکھا ہے۔ ضرورت محسوس ہو رہی کہ ایک اقتباس وہاں سے بھی نقل کر دیا جائے تاکہ قاری خود فیصلہ کر لے۔ طاعون کے سبب تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور مولانا نے کچھ وقت گھر پر گزارا تھا۔ یہ اسی زمانہ کی روداد ہے:

''میں طاعون کے خوف سے سلسلہ تعلیم کو چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن یہ بے کاری میرے لیے مفید ثابت ہوئی۔ اعزہ و اقارب میں چند لوگ عالم تھے اور کچھ کتابیں، جن میں زیادہ تر حصہ درسی کتابوں کا تھا جمع کر لیں تھیں۔ میں ان کے اس مختصر کتب خانے سے منطق و فلسفہ کی

کتابیں مثلاً شرح مطالع، ملا جلال، حمد اللہ، میر زاہد، امور عامہ وغیرہ مانگ کر لاتا تھا۔ زیادہ تر کتابوں پر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے حاشیہ ہوتے تھے اور وہ اپنے تبحر علم اور طرزِ تحریر سے مطالب کو نہایت آسان کر دیتے تھے۔ ان کتابوں کے مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر اور احسان ہوا کہ مجھ کو عقلیات سے دلچسپی ہوگئی اور صرف وہی کتابیں پسند آنے لگیں جو عقلی اصولوں کے مطابق لکھی گئی ہوں۔ یعنی دعویٰ، دلیل اور علل واسباب پر بحث ہو۔ میرا یہ ذوق اب تک قائم ہے اور تاریخی، ادبی مذہبی ہر کتاب میں ان چیزوں کی جستجو کرتا ہوں۔''

جس شخص کا ذوق یہ ہو اور جس کے رجحانات میں عقل، دعویٰ اور دلیل کو کلیدی اہمیت حاصل ہو اس پر سہل انگاری کا الزام لگانا چہ معنی دارد۔

آگے کا کمال ملاحظہ فرمایئے:

''ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں کہ جن کا دکھانا بڑا نازک کام ہے، مگر اس کے بغیر ان کی اہم خصوصیات کا ایک بڑا دلکش رخ سامنے نہ آئے گا، مگر ان کو ایک خاص پسِ منظر میں دیکھنا ضروری ہے ورنہ اس کا پورا لطف حاصل نہ ہوگا اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم ہوگی۔ ان کو مراق کا پرانا مرض تھا اور کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، اس لیے ان پر ہمیشہ جذب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ کھوئے سے کھوئے سے رہتے تھے اور ان کے خیالات اور اعمال میں توازن باقی نہیں رہ گیا تھا۔ خصوصاً دورے کے زمانہ میں ان کو اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہ جاتا تھا اور وہ 'رفع القلم عن ثلاث' کے حکم میں آجاتے تھے۔ یوں تو ان پر ہمیشہ مراق کا اثر رہتا تھا مگر کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے۔ یہ دورے دو قسم کے ہوتے تھے، جن کو رجائی اور قنوطی کہہ سکتے ہیں۔ ان دوروں میں ان کو اپنے اوپر مطلق قابو نہ رہ جاتا تھا۔ رجائی دورے میں سراپا جوش وخروش، زندگی وحرکت اور نشاط ومسرت بن جاتے تھے۔ ان کے ہر موئے بدن سے زندگی اور مسرت کے چشمے ابلتے تھے۔ ہر چیز میں ان کو مسرت ہی مسرت اور حسن ہی حسن نظر آتا تھا، ان کے لئے ہر جلوہ جنت نگاہ اور ہر نغمہ فردوس گوش بن جاتا تھا اور وہ رسوم وقیود سے بے پروا اپنے حال میں مست وسرشار رہتے تھے۔ ہر وقت حرکت میں رہتے، بازار کے کئی کئی چکر لگاتے، دارالمصنفین کے احاطہ میں ہر وقت چلتے رہتے، رات بھر ٹہل ٹہل کر اشعار پڑھتے، خصوصاً چاندنی راتوں میں پوری رات جاگتے تھے۔ اکثر زیرِلب باتیں کرتے رہتے، طبیعت میں بڑی جودت پیدا اور قوتِ گویائی بڑھ جاتی تھی اور علمی اور مذہبی مسائل میں مجتہدانہ شان پیدا ہوجاتی۔ بات بات میں مباحثہ کے لیے تیار ہوجاتے اور ان کی افتادِ طبع کے

خلاف تعلّی بھی پیدا ہو جاتی ۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتے، گفتگو بھی بڑی شاعرانہ کرتے ۔ قلم میں بھی بڑا زور پیدا جاتا، مگر کوئی متوازن تحریر نہ لکھ سکتے تھے ۔ تعدّدِ ازواج پر ان کا جو مضمون رسالہ ثقافت لاہور نے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ شائع کیا ہے، وہ اسی دور کی یادگار ہے ۔''

مولانا کی جو بھی تحریریں 'رجائی دور' کی پیداوار ہیں وہ متوازن نہیں ہیں؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے جو ان کی ہر تصنیف پر لگایا جاسکتا ہے اور پھر یہ بھی تحقیق کرنی پڑے گی کہ یہ کون سے دور کی تخلیق ہے ۔

اب ذرا 'قنوطی دور' کی روداد بھی سن لی جائے:

''اس کے مقابلہ میں دوسرا قنوطی دورہ ہوتا تھا ۔ اس میں دل و دماغ پر غم ناک خیالات کا ہجوم ہو جاتا تھا ۔ ہر چیز میں یاس و ناامیدی نظر آتی تھی، ہر وقت افسردہ اور غمگین رہتے تھے ۔ حال و مستقبل بالکل تاریک نظر آتا تھا ۔ ہر وقت اپنی اور اہل و عیال کی تباہی کے وہم سے پریشان رہتے تھے ۔ لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ جاتا تھا ۔ رات دن پلنگ پر بالکل خاموش پڑے رہتے اور جب بولتے تو اپنی پریشانیوں اور مستقبل کے خطرات کا رونا روتے اور اپنی داستان سنا کر ہر شخص سے ہمدردی کے طالب ہوتے ۔ ان دوروں میں ان کو اپنی کسی چیز پر قابو نہیں رہ جاتا تھا اور ان کے رفیقوں کو ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا ۔ اس مرض کا اثر ان کی پوری زندگی پر تھا ۔''

اس اقتباس کے مطابق مولانا کو رجائی اور قنوطی دونوں دوروں میں اپنے اوپر قابو نہیں رہتا تھا ۔ رجائی دوروں میں کوئی متوازن تحریر نہیں لکھ سکتے تھے اور قنوطی دورے میں لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ جاتا تھا ۔ خدا جانے مولانا نے جو کچھ لکھا وہ کب اور کیسے لکھا ۔ دنیا خوامخواہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے ۔ جس شخص کو نہ تو اپنے اوپر قابو تھا اور نہ اپنی تحریر پر، اس کے علمی سرمایہ پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ ہے وہ تصویر جو اس 'خامہ فرسائی' کے نتیجہ میں آنکھوں کے سامنے آتی ہے ۔

مولانا کے سیاسی عقیدے پر بھی ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''انگریزی تمدن اور انگریزی حکومت کی شان و شوکت کی بنا پر انگریزوں کے بڑے مداح تھے اور حکمرانی، انگریزوں پر ختم سمجھتے تھے ۔ ان کے نزدیک ہندوستان و پاکستان کسی میں بھی حکومت کی اہلیت نہیں تھی ۔ ان کے ذہن میں آزادی اور غلامی کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہ تھا کہ جس حکومت میں حسنِ انتظام، شان و شوکت، امن و امان اور خوش حالی ہو وہی اصلی وہی اصلی حکومت ہے ورنہ پنچایت ہے ۔''

مولانا کی وفات ۱۹۵۶ء میں ہوئی ۔ ملک تب تک آزاد ہو چکا تھا ۔ ان کے سیاسی عقائد کا کوئی دستاویزی

ثبوت تو نہیں ہے لیکن جو شخص علامہ شبلی کا تربیت یافتہ ہو اور جو ایک زمانہ تک مولانا ابوالکلام آزاد کا دستِ راست رہا ہو، اس کے سیاسی خیالات اس نہج کے ہوں، یہ باور کرنا ذرا مشکل ہے۔ اپنی 'دبو' فطرت اور طبعی خوف کی وجہ سے عملی سیاست میں حصہ نہ لینا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ ماننے میں تامل ہے کہ مولانا دل سے بھی انگریزی تسلط کو برا نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح علمی حلقوں اور ادبی مجلسوں میں اکثر یہ بات سنائی دیتی ہے کہ سیرت النبیؐ کی جو آخر کی پانچ جلدوں (دو تو علامہ شبلی نے خود لکھیں) میں زیادہ تر مولانا نے لکھی ہیں۔ ہم اسے صرف قیاس سمجھتے ہیں۔ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ خود مولانا نے اپنی زبان سے اس کے تعلق سے کچھ نہیں کہا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی چمنستانِ شبلی کے دو ایسے پھول ہیں، جو گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک کا قد بڑھانے کے لیے دوسرے کے قد کو گھٹانے کی ہر کوشش مذموم اور قابلِ مذمت ہے۔

اگر مولانا کی علمی فتوحات پر نظر ڈالیں تو یہاں کمال کا تنوع نظر آتا ہے۔ اس میں سیرت بھی ہے، تاریخ بھی، فلسفہ بھی ہے اور ادب بھی۔ سیرت النبیؐ کی پانچ جلدوں پر جو کام کیا ہے، اس کے علاوہ 'اسوۂ صحابہؓ'، 'اسوۂ صحابیات' اور 'سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ' ان کی شاہکار تصانیف ہیں۔ حکمت اور فلسفہ پر 'حکمائے اسلام' کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب ہے۔ ادب پر 'شعر الہند' نام کی ایک تصنیف ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور جدید معروضی تنقید کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ 'اقبال کامل' ایک رہنما کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے علاوہ ان کی ان غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، جو زبان کی صحت کے سلسلہ میں ہوئی ہیں اور یہ بڑی جرأت کا کام ہے۔ ایک شعر دیکھئے:

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائل گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

مولانا کا کہنا کہ 'لب مائل گفتار تھے' ہونا چاہیے۔ لب چوں کہ دو ہوتے ہیں، اس لیے شعراء اس کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ لاتے ہیں۔

اس کتاب میں 'اغلاط' کے نام سے ایک پورا باب باندھا گیا ہے اور زبان و بیان کی غلطیوں پر گرفت کی گئی ہے۔ بات علامہ اقبال کی ہے، اس لیے یہ جرأت اور بھی رندانہ لگتی ہے۔ مزید برآں اقبال کا مطالعہ بحیثیتِ شاعر کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے زیادہ تر انھیں حکیم اور فلسفی کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

مولانا نے کئی ساری عربی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جیسے 'تاریخِ فقہ اسلامی'، 'ابن خلدون'، 'انقلاب الامم'، 'القضاء فی الاسلام' اور 'فقرائے اسلام' وغیرہ۔ اس کے علاوہ معارف کے شماروں میں ہزاروں مضامین ہیں جو اپنے تنوع اور تفکر کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔

کوئی بھی مصنف، چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور اس کی کتابیں کتنی ہی پر مغز کیوں نہ ہوں، ایک زمانہ آتا ہے کہ اس پر ایک گرد پڑ جاتی ہے (تحریکی لٹریچر الگ ہے، کیوں کہ وہ برابر ریسائیکل ہوتا رہتا ہے)۔ مولانا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور ان کی بازیافت اور یہ گرد ہٹانے کا کام ان کے خانوادہ سے تعلق رکھنے والے پرنسپل ہارون آعظمی صاحب نے کیا۔ مہمیز کرنے کا کام صاحبِ طرز ادیب، شاعر اور صحافی شمیم طارق صاحب نے کیا اور علمی محاذ کی کمان مولانا کے سب سے عزیز شاگرد اور ان کی علمی وراثت کے امین کبیر احمد جائسی نے سنبھالی۔ ہارون صاحب نے سیمینار آرگنائز کرنے اور دنیا کو پھر سے مولانا سے متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ تین سیمینار بھی ہوئے۔ ایک جامعۃ الفلاح میں اور دو ممبئی میں۔ علمی مورچہ شمیم طارق اور کبیر جائسی نے سنبھالا۔ مقالات کے لیے علمی ہستیوں سے رابطہ کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں 'مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر' نام کی کتاب وجود میں آئی۔ یہ مختلف دانشوران کے ان مقالوں پر مشتمل ہے، جو فلاح کے سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ یہ کتاب مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن سے چھپی ہے۔ بقیہ دو سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالے بھی کتابی شکل میں موجود ہیں۔ اسی طرح کبیر جائسی کی کتاب 'مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی' بھی اسی فاؤنڈیشن نے مولانا کی پچاسویں برسی پر ۲۰۰۶ء میں شائع کی۔ سیمینار آرگنائز کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ کوئی ہارون صاحب کے صاحبزادے رئیس بھائی سے کوئی پوچھے۔ تیسرے سیمینار (جو آخری ثابت ہوا) کے دوران ہارون صاحب کی طبیعت انتہائی ناساز تھی اور انھوں نے برجستہ یہ اعلان بھی کیا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری سیمینار ہے۔ خدا کی مشیت دیکھیے کہ یہ آخری سیمینار ہی ثابت ہوا اور وہ اس کے بعد اپنے رب سے جا ملے۔ لیکن یہ ان کی مساعی کا ہی نتیجہ ہے کہ ایک بار پھر سے لوگ مولانا عبدالسلام ندوی کے بارے میں بات کرنے لگے ہیں، نہیں تو وہ 'کنزاً مخفیا' بن چکے تھے۔

مولانا کی انشاء پردازی، جادو بیانی اور نثر کے سحر کا تو دنیا لوہا مانتی ہے، لیکن وہ ایک خوبصورت، نغز گو شاعر بھی ہیں۔ افسوس کی انھوں نے خود اپنے کلام کو سینت کر نہیں رکھا، اس لیے اسکا ایک اچھا خاصہ دریا برد ہو گیا۔ سلیم بھائی نے، جو دوستوں اور شناساؤں میں پپو بھائی کے نام سے جانتے ہیں اور بہت صاف ستھرا شعری ذوق رکھتے ہیں، ایک حالیہ ملاقات میں ہادی اعظمی کا نام لیا اور بتایا کہ انھیں مولانا کا بہت سارا کلام یاد تھا جو وہ فرمائش پر سنایا

کرتے تھے۔ ہادی صاحب کے بے مثال ترنم کا بھی ذکر آیا تھا۔ اب کہاں وہ مشاہیر اور کہاں وہ مجلسیں۔

مولانا نے 'میری محسن کتابیں' میں شعر و اور شاعری سے اپنے شغف کا تذکرہ کیا ہے۔ ابتدائی اثر ان کے بہنوئی محبوب الرحمان صاحب کا ہے، جو کلیم تخلص کرتے تھے۔ کہا جاتا کہ مولانا نے بھی اسی سے متاثر ہوکر اپنا تخلص شمیمؔ رکھا تھا۔ محبوب الرحمٰن صاحب پر ابھی کچھ دنوں پہلے شبلی کالج کی نمائندہ میگزین 'بزم شبلی' میں مشہور محقق، دانشور اور ماہر شبلیات ڈاکٹر الیاس احمد الاعظمی کا ایک مضمون نظر سے گزرا۔ وہ بجا طور پر شکوہ کرتے ہیں کہ اقبال سہیل، مرزا احسان احمد اور امجد غزنوی کی طرح کلیم صاحب کو بھی وکالت کھا گئی ورنہ ان کی ذات سے علم وادب کو بہت فیض پہونچ سکتا تھا۔ دونو دریافت غزلیں بھی مضمون میں شامل ہیں:

کبھی نظر سے جو غائب وہ رشکِ ماہ رہے
ہماری آنکھ میں سارا جہاں سیاہ رہے
مزا وہ عشق میں پایا کہ مانگتا ہوں دعا
کسی کے عشق میں حالت مری تباہ رہے

دوسری غزل کے یہ دو شعر دیکھئے

طبیعت تو بہل جاتی ہے کچھ میری شبِ غم میں
درِ دل سے لگی تیری جو تصویرِ خیالی ہے
سوادِشامِ فرقت سے نہ کیوں تسکین ہو دل کو
سیاہی گیسوئے جاناں کی کچھ اس نے چرا لی ہے

مولانا کا جو بھی کلام آج ہمارے پاس پہنچا ہے اس پر قدما اور اساتذہ کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ متقدمین عموماً دو دبستانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ۔ مولانا کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دبستانِ دہلی کے مقابلے میں ان پر دبستانِ لکھنو کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ حکمت اور فلسفہ سے شغف کے باوجود وہ اپنے اشعار میں حکیم اور فلسفی کے بجائے عاشقِ صادق زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح عربی زبان اور ادب سے واقفیت کی وجہ وہ کچھ ایسے استعارات استعمال کرتے ہیں جو راقم کے علم کے مطابق پہلے کبھی استعمال نہیں ہوئے۔ یہ شعر دیکھیے

ذرا تو ہاتھ تو رکھ دے کسی کے روئے روشن پر
مرا ذمہ جو اے زاہد ید بیضا ء نہ ہو جائے

'ید بیضاء' کی ترکیب اس سے پہلے بہت کم شعراء نے استعمال کی ہے۔ یہ وہ معجزہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوا تھا۔

حضرت یوسف اور زلیخا کی تلمیح بہت شاعروں نے استعمال کی ہے۔ دیکھیے مولانا نے اسے کیسے باندھا ہے:

یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا
تقدیر تھی کی حسن کی قیمت ٹھہر گئی

اسی غزل کا کیا خوبصورت مطلع ہے

چہرے تک ان کے مست گئی بے خبر گئی
جب جب گئی نگاہ بنوعِ دگر گئی

تصویرِ یار سے گفتگو ایک بہت پامال موضوع ہے، لیکن مولانا کا یہ شعر دیکھیے کہ کس خوبصورتی سے اس مضمون کو انھوں نے برتا ہے:

زبانِ بے زبانی سے ہم بڑھ کر کون سمجھے گا
تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں

اور یہ شعر دیکھیے:

لاکھوں قفس ہیں لائے گی کس کس میں بوئے گل
چڑھنے لگی سانس صبا کی بہار میں

قفس، بوئے گل، صبا اور بہاران چاروں کو کس چابکدستی سے مولانا نے باندھا ہے اور کیا بات پیدا کی ہے۔ اور یہ شعر بھی کس کمال کا ہے

تارے بھی جھلملا کے بہ حسرت ہوئے غروب
کیا کیا بجھے چراغ شبِ انتظار میں

ان دو اشعار میں جو سرمستی کی کیفیت ہے وہ صرف ''اہل دل'' ہی جان سکتے ہیں:

مستی میں کھینچ لیتے ہیں رندانِ مے پرست
دامن پکڑ کے رحمتِ پروردگار کا
لاکھوں مصیبتیں ہیں مگر پھر بھی روزِ حشر
محبوب ہے کہ دن ہے ترے انتظار کا

مولانا شمیم تخلص کرتے تھے اوراس مقطع میں راہ اور منزل کے پامال استعارے کو کس طرح سے برتا ہے، دیکھیے:

راہ بے پایاں تھی وجہ گرم رفتاری شمیم
قرب منزل نے تھکایا اب قدم اٹھتے نہیں

یہ چند اشعار مشتے نمونہ ازخروارے نقل کر دیے۔افسوس کہ نہ تو خود مولانا نے توجہ کی اور نہ ان کے اصحاب نے اوران کی شاعری کا سرمایہ ضائع ہو گیا۔

صریحاً علمی بد دیانتی اور اخفائے حق ہو گا اگر ہم کم از کم ایک ایسا اقتباس شاہ معین الدین صاحب کے طویل مضمون سے نہ نقل کر دیں جو 'کلمہ خیر' کے زمرے میں آتا ہے۔لکھتے ہیں:

''ان میں بعض اوصاف تھے جو اس زمانہ میں ناپید ہیں۔آج کل کتنے تسبیح و مصلے والے ایسے ہیں جن کا دامن حقوق العباد سے پاک اور معاملات میں صاف ہو اور جن سے کسی انسان کو ایذا نہ پہنچی ہو۔مولانا عبدالسلام صاحب کا دامن ان تمام معاملات میں معصوم بچوں کی طرح بے داغ تھا۔ان کے ذمہ کسی کا ادنی حق بھی نہ تھا بلکہ اپنی حق تلفی پر بھی وہ خاموش رہتے تھے۔ان کی ذات سے کسی کو ادنی تکلیف بھی نہیں پہنچی۔یہ معمولی بات نہیں ہے۔اس زمانہ میں اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ان کے مضامین اور ان کی مذہبی کتابوں سے بہتیرے مسلمانوں کو ہدایت حاصل ہوئی۔اس لیے ان کی یہ نیک اعمال رائیگاں نہ جائیں گے''

مولانا کی مرنجاں مرنج طبیعت کے لیے انگریزی میں ایک لفظ (enigma) ہے۔یعنی وہ شخص، جو سال بھر گدّ و پور کے میلہ کا انتظار کرتا رہتا (علاؤالدین پٹی کے بغل میں ایک گاؤں ہے جو سال میں ایک بار میلہ لگتا تھا اور مولانا بہت شوق سے جاتے تھے)۔قالین گنج میں پیشہ ور عورتوں کے ساتھ بے جھجھک بات کرتا، سخت جاڑے کے موسم میں کبھی کبھی فجر کی نماز یہ کہہ کر قضا کر دیتا کہ 'دل جمعی' نہیں ہو رہی ہے (یہ ساری باتیں ہم نے اپنے والد مرحوم کی زبان سے سنی ہیں) جب قلم اٹھاتا تو دینیات، فلسفہ اور شعر ادب پر علم کے دریا بہادیتا، اس کی شخصیت کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔شاید ان کا یہ شعر کچھ مدد کر سکے

سامان کیا زیارتِ صحرا کے واسطے
چادر لپیٹ لی کبھی عریاں نکل پڑے

●□●

اداس کیوں ہے آخر مرا مینار فلاح

رضوان احمد فلاحی

گزشتہ چند ماہ میں زندگی کی مالائیں ایسی ٹوٹیں اور ایک کے بعد ایک دانے ایسے بکھرے کہ رہ جانے والے شناسا اور احباب کے ہوش اڑ گئے۔ مولانا عبدالحلیم فلاحی، پروفیسر اشتیاق دانش، مولانا مقبول احمد فلاحی، ڈاکٹر نسیم الحق، خالد حنیف صدیقی، ڈاکٹر احسان اللہ فہد، ڈاکٹر امان اللہ فہد، ڈاکٹر غفران اور ڈاکٹر فرید وغیرہ کی رخصتی وابستگانِ جامعہ کے لیے باعثِ رنج والم ہے۔ جامعۃ الفلاح کے ان فرزندوں کے علاوہ دور بستیاں بسانے والوں میں پروفیسر یاسین مظہر صدیقی، پروفیسر عطاء اللہ صدیقی (برمنگھم) اور پروفیسر شکیل صمدانی بھی شامل ہیں۔ کتنے اور نام ہیں جو اس فہرست میں نہیں آسکے۔ یکے بعد دیگرے دیپ بجھتے چلے گئے۔

کوئی بتائے کب بدلے گی اپنا یہ معمول ہوا
جلتے دیپ بجھانے میں صدیوں سے مشغول ہوا

مولانا عبدالحلیم فلاحی صاحب مجھ سے دو سال سینئر تھے اور میرے بڑے کرم فرما۔ قلم وقرطاس سے لگاؤ تھا۔ ان کے مضامین بھی شائع ہوئے اور انہوں نے بعض معتبر عرب مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ دہلی کے معروف دعوتی ادارہ 'مدھر سندیش سنگم' سے وابستہ تھے۔ کورونا کی وبا میں گھر شاہ گنج آئے اور وہاں سے عالم جاودانی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر نسیم الحق اور خالد حنیف صدیقی تو میرے کلاس فیلو ہی تھے۔ اول الذکر ۱۹۷۵ء میں جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ طبیہ کالج میں پڑھنے چلے گئے۔ ان سے آخری ملاقات علی گڑھ ہی میں ہوئی۔ خالد حنیف صدیقی سے پس فراغت ایک اتفاقی ملاقات اردو بازار، جامع مسجد دہلی میں کتب خانہ عزیزیہ میں ہوئی۔ یہ ملاقات بھی ان سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر احسان اللہ فہد سے پہلی اور آخری لیکن مختصر سی ملاقات ۲۰۱۴ء میں دار المصنفین کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ہوئی تھی۔ امان اللہ فہد اور ڈاکٹر غفران سے صرف غائبانہ تعارف رہا۔

ڈاکٹر فرید احمد میرے زمانۂ طالب علمی میں جامعہ میں تھے، لیکن ثانوی میں۔ اس لیے ان سے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ کئی برس پہلے کیفیات ایکسپریس سے دلی جاتے ہوئے ملاقات ہوئی اور انہیں کسی قدر قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں انہوں نے 'ملت کانگرس' کا ڈول ڈالا تھا اور ان کے بیانات اردو اخبارات میں کبھی کبھی جگہ پالیتے تھے۔ اسی کوچ میں جامعہ کے سابق استاذ مولانا اقبال قاسمی صاحب مرحوم اپنے اہل خانہ کے ساتھ علی گڑھ جارہے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے جاوید اقبال ساتھ تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر فرید سے میرا تعارف کرایا، وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئے اور بغیر کسی استفسار کے بتایا کہ وہ بڑی دیر سے CO Sagri سے گفتگو کررہے تھے جو اسی کوچ میں سفر کررہے ہیں۔ بعدازاں تقریباً ایک گھنٹے تک وہ جامعۃ الفلاح، ندوۃ العلماء اور علی گڑھ میں گزارے گئے دنوں میں اپنی فتوحات کا تذکرہ کرتے رہے۔ گفتگو میں جابجا احساس تعلیٰ کی ہلکی سی تپش محسوس ہوتی تھی، بالخصوص تذکرہ علی گڑھ میں۔

پروفیسر یاسین مظہر صدیقی صاحب پر کچھ لکھنا، گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اسلامی تاریخ نگاری پر وہ سند کا درجہ رکھتے تھے۔ پروفیسر شکیل صمدانی، ڈین فیکلٹی آف لا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سے ملاقات تو صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی لندن میں ہوئی، پھر واٹس ایپ رابطہ کے بقا کا ذریعہ رہا۔ دوسال قبل وہ اپنے افراد خانہ کے ساتھ لندن تشریف لائے تھے تو ہمارے صحافی دوست محمد غزالی خاں نے ایک ٹی وی چینل کے لیے ان کا انٹرویو لیا، معاونت کے لیے انہوں نے مجھے بھی ساتھ رکھا، اچھی ملاقات رہی۔

خوش شکل، خوش مزاج، ہنس مکھ، شوق علم اور تواضع وانکساری — ان عناصر کو یکجا کیجیے تو ڈاکٹر عطاء اللہ صدیقی کا پیکر تصور میں ابھرتا ہے۔ مرحوم کا تعلق دارجلنگ سے تھا اور وہاں سیمی سے وابستہ تھے۔ پھر انہیں اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر، برطانیہ آنے کا موقع ملا جہاں انہیں علمی تشنگی بجھانے کا موقع ملا۔ انٹرفیتھ کے میدان میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی اور اس موضوع پر انہیں برطانیہ اور یوروپ میں اتھارٹی کا درجہ حاصل رہا۔ راقم الحروف کو کبھی اس انٹرفیتھ پر شرح صدر نہیں رہا۔ میں اسے 'وحدت ادیان' کی تحریک سمجھتا ہوں جو قدرے بدلے انداز سے اپنے آپ کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تمام ادیان برابر ہیں، کوئی اس میں افضل نہیں ہے۔ جس کو جس مذہب پر اطمینان ہو اسے اختیار کرے اور کسی مذہب کو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں افضل نہ سمجھے۔ پروفیسر صدیقی میرے خیال کے مخالف نہیں تھے، تاہم ان کا کہنا تھا کہ جب انٹرفیتھ کا ادارہ عملاً میدان میں ہے تو ہمیں اس میں اپنی راہ نکالنی ہوگی۔

مرحوم ایک اکیڈمک شخصیت تھے۔ اسی لیے جب اسلامک فاؤنڈیشن نے اپنے نو قائم کردہ تعلیمی ادارے Markfield Institute of Higher Education (MIHE) کی بنیاد ڈالی تو اس کا انتظامی سربراہ عطاء اللہ بھائی کو بنایا۔ یہ ذمہ داری انہوں نے بادل نخواستہ قبول کی کیوں کہ اس کی وجہ سے علمی مصروفیات بہت متاثر ہوتی ہیں۔ پھر جیسے ہی ادارہ کو متبادل میسر آیا انہوں نے فوراً اس سے نجات حاصل کی اور صرف تدریس اور علمی سرگرمیوں کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی جہت سے انتظامی معاملات سے انہیں منسلک رہنا پڑا۔ گزشتہ سال کے بالکل آغاز میں وہ اپنی ریٹائرمنٹ پر بہت خوش ہوئے کہ اب وہ تمام انتظامی ذمہ داریوں سے آزاد ہو کر اپنے ادھورے علمی منصوبوں کی تکمیل کریں گے۔ لیکن

من درچہ خیالم فلک درچہ خیال

ابھی ریٹائرمنٹ کو چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ کینسر کے موذی مرض نے انہیں آلیا۔ تشخیص ہوتے ہی فوراً آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا اور پھر کیموتھراپی اور ریڈیوتھراپی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بحالی صحت کا سفر جاری تھا کہ یکایک دسمبر ۲۰۲۰ء کے آخر میں طبیعت پھر بگڑ گئی اور چند روز بعد وہ اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ انتقال کی خبر مجھے نصف شب میں استاذ خرم مراد مرحوم کے صاحبزادے فاروق مراد بھائی نے دی۔ ایک لمحے کے لیے یقین نہیں آیا، لیکن یقین تو کرنا ہی پڑا۔

اسی وقت پروفیسر اشتیاق دانش مرحوم کو مطلع کیا۔ ظاہر ہے وہ بھی اس خبر سے بے حد ملول ہوئے۔ دیر تک ہم دونوں مرحوم کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اشتیاق نے بتایا کہ چند ماہ قبل ان سے فون پر بات ہوئی تھی اور لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد دو تین ماہ کے لیے برطانیہ آنے کا پروگرام ان کے سامنے رکھا تھا، جس کی انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اب وہ رخصت ہو گئے۔ راقم نے ان پر زور دیا کہ وہ پروگرام پر ضرور عمل کریں۔ قیام کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میرا گھر حاضر ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے چند کتابوں کا عکس درکار ہے اور یہ لندن یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔ عرض کیا کہ لاک ڈاؤن نے لائبریری کے دروازے ابھی بند کر رکھے ہیں۔ آپ فہرست بھیج دیجیے۔ لائبریری کھلنے پر کام ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔ اخیر میں انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر ابھی کل ہی ان کی ایک کتاب آئی ہے۔ آپ کا نسخہ میرے پاس محفوظ ہے، جیسے ہی کوئی ذریعہ ملا، بھجوا دوں گا۔ یہ میری ان سے آخری گفتگو تھی۔ پھر جو خبر آئی وہ دائمی جدائی کی خبر تھی۔

پروفیسر اشتیاق دانش جامعۃ الفلاح میں مجھ سے تین سال پیچھے تھے۔ اس دوران ان سے کوئی خاص

ربط نہیں رہا۔ ان دنوں ان کی شاعرانہ حیثیت کا چرچا تھا۔ دو ایک مرتبہ ان کا کلام سننے کا موقع ملا، اور بس۔ ان سے صحیح معنوں میں دوستانہ تعلقات اس وقت استوار ہوئے جب وہ اسلامک فاؤنڈیشن کے عیسائی مسلم تعلقات کے شعبے میں اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے فاؤنڈیشن کی اسکالرشپ پر برطانیہ تشریف لائے۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ گزار کر وہ واپس چلے گئے۔ وہ بھی متمنی تھے اور ہماری بھی خواہش تھی کہ وہ یہاں کی کسی یونیورسٹی سے کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کرلیں۔ لیکن حالات کا جبر خواہش کی تکمیل میں حارج رہا۔ بعض حضرات کا یہ خیال کہ انہوں نے برطانیہ سے بھی کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کی تھی، درست نہیں ہے۔

مرحوم مطالعہ کے شوقین تھے۔ زیادہ وقت کتابوں کے درمیان گزرتا تھا۔ ساتھ ہی قلم کے ذریعہ اظہار مدعا پر قادر تھے۔ انہیں قدرت نے جن صلاحیتوں سے نوازا تھا، اس کا انہیں بخوبی ادراک تھا۔ وہ مجہول اور منفی قسم کے انکسار کا شکار نہیں تھے، جس کی سرحدیں ذات وصلاحیتوں کی نفی سے جاملتی ہیں۔ یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ انہوں نے عطا کردہ صلاحیتوں سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور خلق خدا کو بھی فائدہ پہنچایا۔ بلاشبہ وہ جامعۃ الفلاح کے ایک مایہ ناز فرزند تھے۔

ابھی اشتیاق دانش کی جدائی کا زخم تازہ ہی تھا کہ بالکل غیر متوقع طور پر محض پانچ دنوں کے بعد (۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء کو) عزیز دوست مولانا مقبول فلاحی کے رخصت ہوجانے کی خبر سن کر دل بیٹھ سا گیا۔ مرحوم سے ہفتہ عشرہ پر ایک بار فون پر بات ضرور ہوجایا کرتی تھی۔ آخری گفتگو رمضان سے ایک ہفتہ قبل ۷/اپریل کو ہوئی تھی۔ حسبِ عادت انہوں نے میری خیریت دریافت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ سے باتیں ہورہی ہیں، میں اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا ہوں، میری ڈائیلاسس ہورہی ہے اور میں شفاف ٹیوب میں اپنے خون کی گردش کا مشاہدہ کررہا ہوں۔ کہنے لگے کہ آپ بڑے دل گردے کے آدمی ہیں۔ میں نے کہا: حضرت، گردے ہی تو شرارت پر اترے ہوئے ہیں جن کی سرزنش کے لیے ہفتے میں تین دن چار چار گھنٹوں کے لیے اسپتال میں مجھے حاضری دینی ہوتی ہے۔ اس جملے کا انہوں نے بڑا لطف لیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت وہ لکھنؤ میں ہیں اور رمضان سے ایک دن قبل وطن جائیں گے۔ پروگرام کے مطابق وہ وطن پہنچے اور چند روز بعد اصلی وطن کو سدھار گئے۔

تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

جامعہ میں وہ معاً میرے بعد تھے اور حافظ محمد اسماعیل فلاحی، ان کے بھائی پروفیسر محمد اسحاق فلاحی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور اظہار احمد فلاحی (جامعۃ الفلاح) ان کے کلاس فیلوز تھے۔ فراغت کے بعد انہیں

جماعت اسلامی بریلی ڈویژن کا ناظم بنادیا گیا۔ان دنوں میں دلی میں تھا۔ جب بھی وہ دلی آتے ان سے ملاقاتیں ہوتیں۔ بریلی ڈویژن کے بعد وہ گورکھپور ڈویژن میں منتقل ہوئے۔ بیرون ملک سے میری جب بھی واپسی ہوتی تو جامعۃ الفلاح میں ان سے ملاقاتیں ہوتیں۔موضوع گفتگو بالعموم جماعت اور جامعہ ہوتے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ شعبۂ رابطہ عامہ کے ذمہ دار کی حیثیت سےجامعۃ الفلاح تشریف لے آئے۔ جامعہ آجانے کے بعد ان سے فون پر اکثر رابطے ہونے لگے اور زیادہ تر گفتگو ادارہ علمیہ کے احیاء اور اس کی کارکردگی بڑھانے کے موضوع پر ہوتی۔

ان ہی دنوں انہیں امریکہ کے دورے پر جانے کا موقع ملا، واپسی پر دوروز کے لیےلندن میں میرے یہاں قیام کیا۔احباب سے ملاقاتیں کیں اوراس پروگرام کے ساتھ واپس ہوئے کہ ایک بار جامعہ کے لیے فنڈ ریزنگ کے لیے آئیں گے۔ چناں چہ دوسری بار اس مقصد کے لیے تشریف لائے۔لیکن مقصد میں کامیابی کی شرح بہت حوصلہ افزا اس لیے نہیں رہی کہ اس میدان کے کھلاڑی نہ وہ تھے نہ میں۔اس سفر میں ایک لطیفہ یہ پیش آیا کہ میرے بیٹے ارقم اور انس ان کے ساتھ زیرزمین ٹرین سے قریب میں واقع ایک محلّہ میں گئے جس کا نام کینیڈا واٹر Canada Water ہے۔ بچوں نے انہیں بتایا کہ انکل، یہ جگہ کینیڈا واٹر ہے۔انہوں نے تفریحاً کہا، ارے ہم بڑی جلدی برطانیہ سے کینیڈا آ گئے۔ بچے اسے سچ سمجھے اور خوب ہنسے۔ انہیں بہت عرصے تک مقبول انکل کا یہ لطیفہ یاد رہا اور بار بار اس کا ذکر کر کے لطف لیتے رہے۔

مرحوم ادارہ علمیہ کے ارتقاء کے لیے فکر مند رہتے تھے اور مجھ سے برابر مشورے طلب کرتے رہتے تھے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میرے متعدد مشوروں پر انہوں نے عمل کرنے کی کوشش کی۔لیکن دشواری یہ تھی کہ ان کے اوپر کے ذمہ داروں کی دل چسپیاں کسی اور جہت میں تھیں اس وجہ سے بہت سے مفید علمی منصوبے کاغذات کی زینت ہی بنے رہ گئے۔ ایک بار انہوں نے مجھے جامعہ سے منسلک چند حضرات کے علمی منصوبوں کی ایک فہرست بھیجی جن پر وہ کام کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ تکمیل پر ادارہ علمیہ ان کی طباعت واشاعت کا اہتمام کرے۔ وہ جو کام کر رہے تھے، اپنی ذاتی دل چسپی کی بنیاد پر کر رہے تھے۔ادارہ علمیہ نے انہیں اس کا مکلّف نہیں بنایا تھا اور وہ جامعہ کے معیار ومنہاج سے ہم آہنگ بھی نہیں تھے۔ میں نے مقبول صاحب سے کہا کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ حضرات جامعہ کے خرچ پر اپنے کریڈٹ میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے اس خیال سے اتفاق کیا اور ان حضرات کو بتادیا کہ ادارہ علمیہ ان کے کام کو شائع نہیں کر سکے گا۔ چناں چہ نتیجہ یہ نکلا

کہ ان سب نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ مرحوم جب تک جامعہ سے وابستہ رہے مجھے ادارہ علمیہ کی سرگرمیوں سے واقف کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد ادارہ میرے لیے بند کتاب ہوکر رہ گیا ہے، حالاں کہ میں اس کا دائمی رکن ہوں۔

رابطۂ عامہ کی ذمہ داری کے ساتھ انہیں نائب ناظم کی ذمہ داری دی گئی جو انھوں نے تین سال تک نبھائی۔ میقات کے اختتام پر انہیں ہر ذمہ داری سے سبک دوش کر دیا گیا اور وہ جامعہ سے چلے گئے۔ ان کے جانے کا نقصان مجھے یہ ہوا کہ جامعہ سے میرا ربط ختم ہوگیا۔ وہ میرے اور جامعہ کے درمیان رابطہ کی کڑی تھے۔ میں اپنی علالت کے سبب گزشتہ چھ سال سے ہندوستان نہیں جا سکا ہوں۔ اس کڑی کے ٹوٹ جانے کے بعد ذہنی فاصلہ کچھ بڑھ سا گیا ہے۔

مقبول صاحب انسان تھے، فرشتہ نہیں تھے۔ ان سے فیصلے کرنے اور انہیں نافذ کرنے میں غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ ان کے طریقۂ کار سے بعض لوگوں کو شکایت بھی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس پر مجھے شرح صدر حاصل ہے کہ جامعہ سے ان کا تعلق اخلاص پر مبنی تھا اور وہ پورے خلوص کے ساتھ اس کی ترقی کے خواہاں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی آخری آرام گاہ کو ٹھنڈا رکھے۔

میرے موبائل میں ان کا نمبر ہنوز محفوظ ہے، نیز ان کے جو مراسلے وہاٹس ایپ میں موجود ہیں، وہ بھی محفوظ ہیں۔ میں انہیں حذف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ان پیغامات کو میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ جب بھی ان کی تصویر کے ساتھ ان کا نمبر اسکرین پر نمایاں ہوتا ہے، خیال ہوتا ہے شاید اس نمبر سے کال آئے اور آواز سنائی دے:

''السلام علیکم، پہلے اپنی خیریت بتایئے، طبیعت کیسی ہے؟''

تجھ سا کہیں کسے!

آہ! ڈاکٹر غفران احمد

پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی

موت ایک حقیقت ہے۔ ہر انسان جو اس دنیا میں ایک متعین مدت حیات لے کر آیا ہے، اس مدت کے ختم ہونے کے بعد اسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ. (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے)۔ حاکم ومحکوم، بادشاہ وفقیر، مرد وعورت، بوڑھا وجوان، آقا وغلام اور امیر وغریب کسی کی بھی زندگی ابدی نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کا کسی کے موت پر افسردہ اور غم زدہ ہونا بھی فطری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں ایسے احساسات وجذبات کو ودیعت فرمادیا ہے جو خوشی اور غم دونوں صورتوں میں متاثر ہوتے ہیں۔ کسی کی موت پر حزن وغم اور درد رنج والم کی یہ کیفیت اس صورت میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے جب کوئی اپنا بہت قریبی رشتہ دار یا بہت قریبی دوست مالک حقیقی سے ملاقات کے لیے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے کسی عزیز کا اس دنیا سے رخصت ہو جانے کا درد وغم کیا ہوتا ہے اس کا حقیقی احساس پہلی بار اس روز ہوا جب ۳۰/ مارچ ۲۰۱۰ء میں والد محترم چلتے پھرتے اور گفتگو کرتے ہوئے اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔ اس روز احساس ہوا کہ والد محترم کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کس قدر عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ افسوس ہم اپنی مصروفیتوں کی بدولت وقت رہتے ہوئے ان کی خدمت کے ذریعہ اپنی آخرت کو سنوارنے کا ساز وسامان نہیں کر پاتے۔ اس روز شدت سے احساس ہوا کہ سراپا رحمت وشفقت اور الفت ومحبت کا یہ شجر سایہ دار اب ہمارے سروں پر نہیں رہا۔ جن کی بدولت اب تک ہم زمانے کی ہر طرح کی الجھنوں اور پریشانیوں سے محفوظ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ ’’رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا‘‘. (اے اللہ ان دونوں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرما جس طرح ان دونوں نے شفقت ومحبت سے ہماری نگہ داشت فرمائی ہے۔)

تجھ سا کہیں کسے!

۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء کو دوسری بار اسی غم والم کا احساس اس وقت ہوا جب اپنے مخلص ترین اور وفا شعار دوست پروفیسر ڈاکٹر غفران احمد (۱۹۶۴-۲۰۲۱ء) کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ ایک لمحہ واقعی ایسا محسوس ہوا کہ پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ اس روز دوسری بار احساس ہوا کہ ایک بہت قریبی اور وفادار دوست کی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے۔ دوست سے خون کا رشتہ تو نہیں ہوتا لیکن بسا اوقات اس قدر قربت اور اپنائیت ہوجاتی ہے کہ اجنبیت کی ساری دیواریں منہدم ہوجاتی ہیں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ قریب معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہم دونوں کی رفاقت ایک دو سال نہیں بلکہ تقریباً چالیس سال پرانی تھی۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دوستی برابر مضبوط ہوتی گئی اور ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوگئے کہ ہم دونوں کی زندگی ایک دوسرے کی لیے کھلی کتاب تھی۔ مرحوم کی طبیعت ۱۰/اپریل سے ہی خراب تھی، بخار مستقل آرہا تھا، لیکن ٹیلی فون اور واٹس ایپ پر یہی کہتے رہے کہ بخار ہے، انشاء اللہ ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ وہ یقیناً اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ 'وہ کرونا' مرض میں مبتلا ہیں۔ ۲۰/اپریل کو میسیج آیا، اللہ کا شکر ہے اور دعا کی درخواست ہے۔ دراصل وہ اپنے مرض کی اطلاع دے کر دوسروں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالی نے ان کو ہمت وحوصلہ عطا کیا تھا۔ ان کی یہ عادت تھی کہ اپنی تکلیف حتی الامکان دوسروں کو سامنے کبھی بیان نہیں کرتے تھے۔ لیکن دوسروں کی تکلیف و پریشانی کو نہ صرف سنتے بلکہ اسے دور کرنے کی عملی تدبیر بھی کیا کرتے تھے۔ تشویش تو ہورہی تھی کیوں کہ کرونا وبا کی دوسری خطرناک لہر شروع ہوچکی تھی۔ ان کے اس مہلک مرض کا علم ان کے شاگرد ڈاکٹر شمشاد عالم اور ان کے بیٹے نصران کے ذریعہ اس روز ہوا جب ان کو آکسیجن میں شدید کمی کے سبب میڈیکل کالج میں ایڈمیٹ کرانا پڑا۔ اس کے بعد مرض کی شدت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مزید بہتر علاج کے لیے ان کے اعزہ ان کو ۲۶/اپریل کو لکھنؤ لے گئے۔

وہ خود ایک ماہر ڈاکٹر تھے۔ سینکڑوں مریضوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے شفا دی تھی۔ میرے والد صاحب جب تک حیات تھے، ان ہی کا علاج کرواتے تھے۔ میری والدہ محترمہ دسیوں سال سے صرف ان کی تجویز کردہ دوائیں کھارہی ہیں۔ میرے ایک فون پر وہ ان کو دیکھنے بذات خود آجایا کرتے اور ان کی دعائیں لیتے۔ دیگر شہروں میں مقیم میرے بھائی بہن بھی ان کے زیر علاج تھے۔ اور وہ خود بھی وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے میں محتاط، کھیلنے اور جسمانی ورزش کا اہتمام کرتے، لیکن جب معاملہ نوشتہ تقدیر کا ہو تو تمام تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں اور تقدیر کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔ بہر کیف کئی دنوں تک تو مجھے خود یقین نہیں

آیا۔ میرا دل کسی طرح اس خبر کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اب میں اپنے عزیز ترین دوست کی رفاقت، اس کی بے لوث محبت، اس کی عنایتوں اور اس کے مخلصانہ مشوروں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہوں۔ میں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک اور اچھے بندوں کو جلد اپنے پاس بلا لیتا ہے اور یہ قول مرحوم کے حق میں سچ معلوم ہوتا ہے۔ وہ واقعی اللہ کے نیک بندے تھے جو بیماری کے حالت میں رمضان المبارک کے مقدس مہینہ اور مقدس دن جمعہ کے روز ۳۰/ اپریل کو اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی لغزشوں اور خطاؤں کو درگزر فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے اہل وعیال کو صبر وسکون عطا کرے، آمین یا رب العالمین۔

ابھی بھی جب کبھی فون پر یا کسی مجلس میں کوئی مرحوم کا ذکر خیر چھیڑ دیتا ہے تو آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اب ہماری بے تکلف ملاقاتیں، پر لطف باتیں محض یادیں بن کر رہ جائیں گی۔ ابھی بھی جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ان کی باوقار شخصیت اور مسکراتا چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ وہ بے پناہ عزم وحوصلہ کے حامل ایک باکردار اور وفا شعار انسان تھے۔ لمبا قد، چھریرا بدن، گورا رنگ، مسکراتی ہوئی بڑی آنکھیں، زیر لب ہنسی، پر تپاک چہرہ، ہلکی خشخشی داڑھی، خوش لباس، خوش مذاق، خوش گفتار انسان کا تصور ذہن پر مرتسم ہو جاتا ہے، ان کی ظاہری شخصیت بھی نہایت پرکشش اور جاذب نظر تھی۔ میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ کسی نئے اور انجان شخص سے پہلی ملاقات کے دوران ہی ان کی گفتگو کے انداز میں ایسی اپنائیت ہوتی کہ وہ شخص پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کو اپنا قریبی دوست اور ہم راز سمجھنے لگتا۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا کمال یہی تھا کہ ہر شناسا شخص ان کو اپنا سب سے زیادہ قریبی دوست سمجھتا اور مرحوم بھی کبھی اسے مایوس نہیں کرتے۔ آج ہمارے معاشرے میں ایسے افراد نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، جن کے پاس دوسروں کی باتیں سننے، ان کے مسائل حل کرنے کے لیے وقت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، طلبہ، ریسرچ اسکالروں کے علاوہ دینی، علمی، سماجی اور سیاسی حلقوں کے لوگ شامل تھے اور یہ تمام ہی افراد ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

وہ دینی ذہن کے حامل تھے۔ جماعت اسلامی کے پروگراموں اور ماہانہ اجتماعات میں شریک ہوتے۔ تبلیغی جماعت کے افراد سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے اور وہ ان کی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تعلقات کو کبھی اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال نہیں کیا، بلکہ وہ بسا اوقات اپنے تعلقات کو اپنے بعض

تجھ سا کہیں کسے!

احباب کے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنی بے پناہ علمی و تحقیقی مصروفیات کے باوجود شعبے اور گھر ہر جگہ پر ہر نو وارد کا مسکراتے ہوئے اور خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ انہوں نے کسی کے لیے 'نا' کہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنا آرام وسکون تج کر اور اپنا ذاتی نقصان برداشت کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچانا ان کی عادت ثانیہ تھی۔ اگر کسی پڑوسی یا جاننے والے کی طبیعت خراب ہو تو اس کے اعزہ سے قبل وہ خود اسے لے کر اسپتال پہنچ جایا کرتے۔ کبھی پوری رات اس کے پاس گزار دیا کرتے۔ ان کے انتقال پر صرف ایک میرا دل ہی افسردہ نہیں بلکہ ان کے احباب کا پورا حلقہ رنج والم کی کیفیت میں مبتلا ہے اور ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔ علی گڑھ میں ان کے احباب ورفقاء کے وسیع حلقے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کی آنکھیں ان کے انتقال کی خبر سن کر اشک بار نہ ہوئی ہوں اور اس کا دل افسردہ نہ ہوا ہو۔

اپریل ۲۰۲۱ء کی دوسری وتیسری دہائی میں کرونا وبا کی دوسری لہر کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بڑی تعداد میں اپنے سبک دوش اور کارگزار قد آور علمی شخصیات سے محروم ہوگئی۔ موجودہ دور میں طب، سائنس اور انجینئرنگ اور ٹکنالوجی اپنی تمام تر محیرالعقول ایجادات وترقیات کے باوجود عالمی سطح پر اس وبائی مرض پر قابو پانے میں اب تک ناکام ہے اور اس دوسری لہر کے دوران صرف علی گڑھ ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ہزاروں افراد اس مرض کے سبب لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔ محترم شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور نے یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اپنے تمام فاضل اور قابل رفقاء کار کی رحلت پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو بالخصوص یونیورسٹی اور بالعموم پوری علمی دنیا کا بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ محترم شیخ الجامعہ نے پروفیسر ڈاکٹر غفران احمد کے انتقال پر اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ہربل میڈیسین کے میدان میں ان کی گراں قدر علمی وتحقیقی خدمات کا ذکر کیا جو عالمی سطح پر ٹریڈیشنل میڈیسن کے میدان میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور مرحوم کے تعلق سے انہوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں ایک خاص بات یہ کہی کہ ''پروفیسر غفران احمد کا رخصت ہو جانا ان کا ذاتی نقصان بھی ہے''۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیخ الجامعہ کو ان سے ذاتی قربت وانسیت بھی تھی اور وہ ان کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ بہرکیف راقم تو تقریباً چار دہائی پر مشتمل ان کی پُر خلوص رفاقت، اور بے لوث محبت، بے غرض احسانات اور بے پناہ اپنائیت کو بھلائے نہیں بھلا سکتا۔

ڈاکٹر غفران احمد اس دور میں انسان اور انسانیت کا درد رکھنے والے ایک عظیم انسان تھے۔ میں نے

بار ہا دیکھا اور محسوس کیا کہ ان کو دوسروں کے کام آکر دلی خوشی ہوتی تھی۔ وہ کسی کی مشکل یا پریشانی کو دور کرنے کے لیے ذاتی طور پر ہر ممکن کوشش کرتے۔ اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کرتے، ان کی نیت ہمیشہ دوسروں کو دینے اور فائدہ پہنچانے کی ہوتی اور بدلے میں کچھ لینے کی خواہش کبھی نہیں رہی۔ ان کا دوسروں کے ساتھ احسان کرنے اور احسان کر کے بھول جانے کی عظیم انسانی صفت کو دیکھ کر مجھے مشہور عرب ادیب اور اجتماعی موضوعات پر لکھنے والے مصنف مصطفیٰ لطفی منفلوطی کا مقالہ 'الغنی والفقیر' یاد آ گیا، جس میں اس نے موجودہ انسانی معاشرے سے اعلیٰ اخلاقی وانسانی قدروں کے رخصت ہو جانے پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا اور اس دنیا میں احسان کرنے والوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> ''انسان اور حیوان کے درمیان وجہ امتیاز احسان ہے، حیوان صرف اپنے وجود کی بھلائی کے متعلق سوچتا ہے مگر انسان صرف اپنے بارے میں نہیں بلکہ اپنے دیگر ساتھیوں کے متعلق بھی فکر مند رہتا ہے، آج معاشرے میں عام طور پر تین طرح کے انسان پائے جاتے ہیں، ایک تو وہ جو دوسروں کے ساتھ اس لئے اچھا سلوک کرتا ہے تاکہ وہ اس احسان کے ذریعہ اس کا استحصال کرے اور اسے اپنا غلام بنالے، یہ انسان کی نہایت ظالم و جابر قسم ہے، دوسرا انسان وہ ہے جو صرف اپنی بھلائی اور اپنے نفع ونقصان کے متعلق سوچتا ہے، یہ اول درجے کا حریص وخود غرض انسان ہے کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ انسان کی رگوں میں بہنے والے خون کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے تو وہ تمام انسانوں کو قتل کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائے، انسانوں کی تیسری قسم وہ ہے جو نہ اپنے اوپر احسان کرتا ہے اور نہ دوسروں پر کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، یہ بیوقوف بخیل ہے جو خود بھوکے پیٹ سوتا ہے تاکہ اس کی تجوری بھری رہے، مگر انسان کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جو دوسروں پر احسان کر کے اسے اپنے اوپر احسان سمجھتا ہے اور وہ کسی کے کام آکر خوش ہوتا ہے اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتا، اور اس انسان کے بلند مقام ومرتبہ کے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا جو معاشرے میں شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں، شاید اسی انسان کو یونانی فلسفی ڈیوجانس دن کے اجالے میں لالٹین لے کر ڈھونڈ رہا تھا، جب لوگوں نے اس فلسفی سے پوچھا کہ دن کے اجالے میں لالٹین لے کر کیوں گھوم رہا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ میں انسانوں کی اس بھیڑ میں انسان کو تلاش کر رہا ہوں''۔

آج ہمارا معاشرہ بھی ایسے بے غرض، مخلص اور محسن انسانوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے جو صرف اپنے دل کی تسلی اور اپنے نفس کی خوشی کی خاطر دوسروں کے کام آتے ہوں اور بدلے کی کوئی توقع نہ رکھتے ہوں۔ میں

تجھ سا کہیں کسے!

اپنے طویل ذاتی تجربات کی بناپر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم غفران احمد واقعی عظیم انسان تھے، جنہوں نے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کی کوشش کی اور اپنے مسائل، اپنی تکلیف اور اپنی پریشانی کو حتی الامکان دوسروں سے چھپانے اور ازخود دور کرنے کی کوشش کی۔ان کے انتقال کے بعد احباب کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ یونیورسٹی کے حلقے میں بہت مقبول تھے، یہاں تک کہ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر صاحبان بھی ان کی تشخیص اوران کی تجویز کردہ دواؤں پر بھروسہ کرتے تھے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علمی مقام ومرتبہ

پروفیسر غفران ایک بااخلاق، ملنسار، شیریں کلام اوراچھے انسان ہونے کے ساتھ علم وتحقیق کی دنیا میں بھی اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔طب یونانی کے علاوہ ماڈرن میڈیسن پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ بحث وتحقیق سے ذاتی دلچسپی تھی۔ بحث وتحقیق کے اس ذوق کو پروان چڑھانے میں ان کے مشفق ومحسن استاد ڈاکٹر یوسف امین صاحب کی تربیت اور سرپرستی کا بڑا دخل تھا۔اپنی محنت اوران کی تربیت کی بدولت وہ اردو سے زیادہ انگریزی زبان میں اپنے تحقیقی مقالات لکھا کرتے تھے، جوانگریزی اوراردو کے ان مؤقر سائنسی جرنلس میں شائع ہوئے جو علمی وتحقیقی اعتبار سے معیاری تصور کیے جاتے ہیں۔ان جرنلس میں کسی روایتی طریقہ علاج سے منسلک ڈاکٹر کے لیے اس کا پیپر شائع ہوجانا بڑے علمی اعزاز کی بات تھی۔ان کے بعض مقالات کے Impact Factor بہت زیادہ تھے۔ وہ اکثر مجھ سے گفتگو کے دوران اپنے بعض تحقیقی پیپر کے متعلق ذکر کیا کرتے تھے، جن کی عالمی سطح کے کانفرنسوں میں بڑی تعریف ہوتی تھی۔

علی گڑھ میں ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ ۱۹۸۳ء میں قدم رکھا۔حسن اتفاق سے ہم دونوں کا تعلق ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ جامعۃ الفلاح سے رہا ہے۔ وہاں کی عالمیت کی ڈگری مسلم یونیورسٹی کے آرٹس اورسوشل سائنس کے کسی بھی سبجیکٹ میں بی-اے کے لیے منظور شدہ تھی۔ چنانچہ راقم نے انگریزی آنرس کا انتخاب کیا اور پروفیسر غفران صاحب اور میرے ایک اور دوست ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے معاشیات (Economics) کا انتخاب کیا۔مدرسے سے فارغ کسی طالب علم کے لیے بی۔اے میں معاشیات کے مضمون کا انتخاب بڑے عزم وحوصلہ کی بات تھی جب کہ عام طور پر گورنمنٹ اسکول سے آنے والے طلبہ بھی اس

مضمون کو لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ میڈیم انگلش اور تمام کتابیں انگریزی میں تھیں اور تیسری بات یہ کہ معاشیات میں بی۔اے کرنے کے لیے کم از کم ہائی اسکول کے سطح کی ریاضیات کے فارمولوں سے واقفیت ضروری تھی۔ چنانچہ جلد ہی اس سال جامعۃ الفلاح سے آنے والے طلبہ اپنا مضمون تبدیل کروا کر عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات میں منتقل ہو گئے اور خاکسار نے بھی انگریزی مضمون کے بجائے عربی میں گریجویشن کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر مجاہد نے بھی غفران صاحب کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنا مضمون معاشیات سے تبدیل کروا کر اردو کروالیا۔ لیکن مرحوم نے ہمت نہیں ہاری اور بے پناہ محنت کر کے انگریزی اور ریاضیات دونوں میں مہارت پیدا کی اور ۱۹۸۵ء میں اچھے نمبرات سے معاشیات میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی۔ چنانچہ ملک کی معاشیات اور معاشی مسائل پر ان کی گہری نظر رہی۔ ملک کی معاشی پالیسیوں اور اس کے اچھے برے نتائج پر کسی ماہر معاشیات کی طرح بڑی علمی گفتگو کیا کرتے تھے۔ شیئر مارکیٹ سے متعلق بھی ان کو اچھی معلومات تھی۔ اگر وہ معاشیات کے میدان میں ہوتے تو وہاں بھی یقیناً کامیاب محقق و مصنف ہوتے۔ بہر کیف گریجویشن کے بعد اپنے والد محترم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بی یو ایم ایس کے مقابلہ جاتی امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہو گئے اور اس طرح یونانی طب اور ہربل میڈیسن سے ان کا رشتہ استوار ہو گیا اور ۱۹۹۲ء میں بی۔یو۔ایم۔ایس اور ۱۹۹۵ء میں ایم ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

اپنے سبجیکٹ میں مہارت اور فطری ذہانت کی بنا پر ان کو ہندستان کے مختلف طبیہ کالجوں میں لکچرر کے آفر آئے، لیکن انہوں نے ۱۹۹۷ء میں اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مستقل استاد کی حیثیت سے تقرری کو ترجیح دی۔ انگریزی زبان میں قدرت، فطری ذہانت اور موضوع میں مہارت کی بدولت ان کو اپنے معاصر رفقاء کار کے درمیان امتیازی مقام حاصل تھا۔ جلد ہی ان کے تحقیقی مقالات عالمی سطح پر مستند اردو اور انگریزی زبان کے طبی جرنلس میں شائع ہونے لگے جو طبیہ کالج کے کسی اسسٹنٹ پروفیسر کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس کے باوجود میں نے کبھی ان کی شخصیت میں کبر، خود نمائی اور خود ستائش کا شائبہ نہیں دیکھا۔ وہ اپنی بڑی سے بڑی علمی کامیابی کا بھی بڑی سادگی اور تواضع کے ساتھ سرسری طور پر ذکر کیا کرتے تھے۔ جب کہ لوگ اپنی معمولی کامیابی کا بھی جشن مناتے ہیں۔ طب یونانی کے میدان میں ان کی غیر معمولی تحقیقی صلاحیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ طبیہ کالج میں لکچرر رہتے ہوئے انہوں نے بنگلور میں طب یونانی کے مرکزی تحقیقی ادارہ (National Institute of Unani Medicines) میں پروفیسر اور جوائنٹ ڈائیریکٹر کے پوسٹ کے لیے درخواست دے دی اور جنرل سلیکشن کمیٹی نے ریڈر اور

تجھ سا کہیں کسے!

پروفیسر کے پوسٹ پر کام کررہے افراد کو چھوڑ کر بالاتفاق ڈاکٹر غفران کو پروفیسر کی حیثیت سے منتخب کرلیا اور انہوں نے ۲۰۰۷ سے ۲۰۰۹ء تک Deputation پر اس مرکزی تحقیقی ادارے میں تدریسی، تحقیقی اور انتظامی خدمات انجام دیں اور اس کے بعد برابر طبیہ کالج کے علم الادویہ شعبے میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ شعبے میں یو۔ جی۔ سی کے DRSاسکیم کے دوسرے مرحلہ 2017-2022 کے کوآرڈینیٹر کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ ان کی ریسرچ کا کمال یہ تھا کہ روایتی طریقۂ علاج کے علاوہ جدید طریقۂ علاج اور ماڈرن میڈیسن پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور دونوں طریقہ علاج کے درمیان مطابقت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا ان کی تحقیق کا خاص میدان تھا۔

انہوں نے اپنی تحقیقات اور تجربات کی روشنی میں متعدد امراض میں کام آنے والی طب یونانی کے دواؤوں کو فائنل شکل دیا اور ان کے طریقۂ استعمال کی وضاحت کی۔ اپنی تدریسی زندگی کے دوران انہوں نے تیس سے زائد ایم۔ ڈی کے تحقیقی مقالات کی نگرانی کی اور دیگر کالجوں میں متعدد مقالات کے ممتحن رہے۔ ہربل میڈیسن سے متعلق تقریباً دس سے زائد قومی و بین الاقوامی ریسرچ جرنلس کے ایڈیٹوریل اور ریویو کمیٹی کے رکن تھے، اس مختصر مدت میں ان کے ۸۰ سے زیادہ تحقیقی مقالات انگریزی اور اردو اور زیادہ تر بین الاقوامی جرنلس میں شائع ہوئے۔ ۳۰/سے زائد نیشنل وانٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کی اور سائنٹفک سیشن کی صدارت کی۔ ۲۰۱۴ء میں AIMS دہلی کی بین الاقوامی کانفرنس میں روایتی طریقہ علاج میں ان کے پیپر کو بیسٹ ریسرچ پیپر کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۲۰۱۶ء میں (IHFS) حیدرآباد نے ان کو بیسٹ یونانی اسکالر گلوبل ایوارڈ سے نوازا۔ ۲۰۱۷ء میں حکومت ہند کی آیوش وزارت ہند کے تحت سنٹرل کونسل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسین (ccrum) نے Best Teacher ایوارڈ دیا گیا۔ ۲۰۱۹ء میں اسی ریسرچ کونسل نے طب یونانی میں تحقیقات کے لیے ان کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا۔ فروری ۲۰۱۹ء میں ایک ہفتے کے لیے ویزیٹنگ فیلو کی حیثیت سے ماریشش میں ہربل میڈیسن میں انگریزی زبان میں لکچرس دیے۔ انہوں نے بنگلور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بڑی کامیابی کے ساتھ متعدد قومی و بین الاقوامی کانفرنسوں کو آرگنائز کیا۔ وہ فی الحال روایتی طریقہ علاج اور ہربل میڈیسن کی تحقیق سے متعلق سنٹرل گورنمنٹ اور ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے تحت مختلف ریسرچ کمیٹیوں میں کام کررہے تھے اور ریاستی سطح پر بھی طب یونانی سے متعلق سرکاری کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

زندہ دلی

اپنی تمام تر علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے باوجود وہ ایک زندہ دل انسان تھے۔ خاص طور پر اپنے بے تکلف دوستوں کی محفل میں اپنے پرلطف مزاحیہ جملوں سے زوردار قہقہہ لگاتے تھے، ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی۔ اگر پریشان بھی ہوتے تو اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ہر طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ پرانے احباب کا بھی ذکر ہوتا لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ ہماری گفتگو مزاح و ظرافت سے نکل کر غیبت کے دائرے میں داخل ہوئی ہو۔ موصوف کو کرکٹ سے جامعۃ الفلاح کے طالب علمی کے زمانے سے ہی خاص دلچسپی تھی۔ جامعۃ الفلاح کی ٹیم میں اپنے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کی بدولت فاسٹ بالر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ یہ دلچسپی علی گڑھ آنے کے بعد بھی باقی رہی اور یہاں بھی طالب علمی کے زمانے میں ہاسٹل کی ٹیم میں آل راؤنڈر کی حیثیت سے کھیلتے رہے۔ کرکٹ اور کرکٹ کے قومی و بین الاقوامی کھلاڑیوں سے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں ان کی غیر معمولی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے قومی کھلاڑیوں کے علاوہ IPL کی مختلف ٹیموں کی کھلاڑیوں کی پرفارمنس پر بھی کسی ماہر کی طرح تکنیکی تبصرے کرتے۔ اپنی تمام تر علمی، تحقیقی و انتظامی مصروفیات اور عائلی و سماجی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے کچھ وقت کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے بھی ضرور نکال لیتے۔ ان کے بڑے صاحبزادے نصران احمد کو بھی کرکٹ کا شوق ہے۔ دونوں میچ کے دوران کسی دوست کی طرح کھلاڑیوں پر تبصرے کیا کرتے۔ ان کو عالمی اور قومی سطح کے قدیم اور جدید کرکٹ کھلاڑیوں کے ریکارڈ یاد تھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بہت زیادہ دین دار اور اللہ سے ڈرنے والے تھے لیکن خشک زاہد اور روایتی عالم دین کی طرح ہمیشہ بزرگی و سنجیدگی اپنے اوپر طاری نہیں رکھتے تھے۔ اپنے دوستوں سے ہمیشہ کھل کر ملتے اور ان سے بے تکلف گفتگو کرتے۔ ان کی یہ عادت شروع سے آخر تک قائم رہی۔ مجھے بی۔ اے کا وہ زمانہ یاد ہے جب راقم، ڈاکٹر ابونصر، ڈاکٹر مجاہد آرٹس فیکلٹی میں کلاس ختم ہونے کے بعد عام طور پر غفران کے ساتھ سلیمان ہال کے بھوپال ہاؤس میں چلے جایا کرتے جہاں ان کے بڑے بھائی عرفان احمد کا کمرہ تھا اور وہ سول انجینیر نگ کے تیسرے سال میں تھے اور وہاں غفران بے تکلف ہم سب کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کا انتظام کرتے۔ اس زمانے میں عام طور پر کمرے میں کھانا بنانے کا رواج تھا۔ ہم لوگ بھی مدد کرتے، ان کے بڑے بھائی ہم لوگوں کو دیکھ کر کمرے واپس چلے جاتے۔ وہ غفران کی طرح ہم لوگوں کا بھی خیال رکھتے۔ اسی

طرح شمشاد مارکیٹ اورتصویر محل میں بھی ہم لوگ اکٹھے چائے بھی پیا کرتے تھے۔ان کی ضیافت کی عادت تو آخرتک قائم رہی۔ میں نہیں جانتا کہ طالب علمی کے دور کا کوئی بھی قدیم دوست کسی کام سے علی گڑھ آیا ہو اور انہوں نے اپنے گھر پر اس کی دعوت نہ کی ہو۔ میرٹھ میں مقیم ہمارے دوست ڈاکٹر اطہر مستقیمی تو اکثر ان کی ضیافت سے مستفید ہوتے بلکہ وہ انھیں اپنی گاڑی سے بس اسٹینڈ چھوڑنے اور لینے بھی جایا کرتے۔ جب میرے بچے چھوٹے تھے تو میں عید کے موقعے پر اکثر بچوں کے ساتھ اپنے وطن پٹنہ جایا کرتا۔ مرحوم کا معمول تھا کہ اپنی گاڑی سے ہم سب کو اسٹیشن ٹرین پر سوار کرتے اور پٹنہ سے واپسی پر اسٹیشن پر ہمارا انتظار کرتے اور فون پر برابر تعلق میں رہتے۔ان کا سالوں یہ معمول رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچوں کو بھی ان کی کمی کا شدید غم ہے۔ جب مرحوم ایم۔ڈی کررہے تھے تو میں جاب میں ۱۹۹۱ء میں آچکا تھا پھر بھی بڑے اصرار سے سنڈے وی۔ایم ہال میں اپنے کمرے پر بلاتے اور خود دوپہر کا اسپیشل کھانا کمرے پر بناتے اور کبھی کوئی تیسرا دوست بھی شریک ہوجاتا ورنہ ہم دونوں ہی رہتے۔کھانا نہایت لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے موصوف کو ان کے اعلیٰ مذاق، نفیس عادت، مہمان نواز، تواضع پسند، طبیعت کے عین مطابق نہایت سلیقہ مند، وفا شعار، شریف النفس، پاک طینت، خدمت گذار فرماں بردار، مہذب اور تعلیم یافتہ شریک حیات عطا کیا تھا۔ دونوں کے فکر ومزاج میں بڑی حد تک یکسانیت تھی۔ ہم ان کی عائلی زندگی میں برابر ان خصوصیات کا مشاہدہ کرتے۔ یونیورسٹی میں داخلہ کے زمانے میں ان کے رشتے دار اور احباب اپنے بچوں کے ساتھ بلاتکلف ان کے مہمان ہوتے۔ اکثر اس زمانے میں ان کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوتا۔ بسا اوقات ان کے بچوں کی تعلیم کا حرج بھی ہوتا مگر دونوں کی زبان سے کبھی شکایت نہیں سنی، ہم دونوں کی دوستی کے ساتھ ہماری بیویاں اور ہم دونوں کے بچے بھی اچھے دوست ہیں اور ہم دونوں کے بچے ایک ہی ساتھ بڑے ہوئے اور اسکول کے مرحلے تک تو اکثر ہمارا اپنے بچوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوتا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بھابھی ہمارے بچوں سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بچوں کی آمد کی اطلاع پاکر ان کے پسند کی چیزیں پکا کر رکھتی تھیں۔ اللہ تعالی سے ہم لوگوں کی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی اہلیہ اور بچوں کو صبر وسکون عطا فرمائے اور ہر طرح سے ان کی مدد کرے، آمین۔ان کے تین بچے ہیں: بڑا بیٹا نصران احمد جو مسلم یونیورسٹی سے انجینیر نگ کرنے کے بعد فی الحال الہ آباد سے ایم۔بی۔اے۔ کے آخری سال میں ہے، دوسرا بیٹا ریان احمد ابھی 2+10 میں ہے اور ایک بیٹی ہے جو ابھی ساتویں کلاس میں ہے، میرا چھوٹا بیٹا بھی 2+10 میں ریان

سے ایک سال آگے ہے اور دونوں گہرے دوست ہیں۔

گزشتہ چالیس سالوں کے دوران شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ ہم دونوں کے درمیان ہفتے میں ملاقات یا فون پر بات نہ ہوئی ہو، ہاں اتنا ضروری ہے کہ وقت کے ساتھ علمی مصروفیات، گھریلو ذمہ داریوں میں اضافہ کی وجہ سے براہ راست ملاقاتیں کچھ کم ہوتیں، وہ ملک یا بیرون ملک جہاں کہیں بھی جاتے اس کی اطلاع ضرور دیتے اور واپسی پر روداد سفر ضرور سناتے۔ ان کی پُر خلوص رفاقت اور محبت میں علی گڑھ میں اتنے سال کیسے گذر گئے اس کا اندازہ ہی نہیں ہوا، اور ان کے ہوتے ہوئے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا، ہم دونوں کی یہ عادت تھی کہ اپنی ہر چھوٹی بڑی بات ایک دوسرے سے ضرور شیئر کیا کرتے اور ہر معاملے میں ایک دوسرے سے مشورہ بھی ضرور لیا کرتے، میری زندگی کے ہر معاملے میں انہوں نے مناسب مشورہ دیا۔

بہرکیف اب مرحوم کے ہمراہ طالب علمی سے لے کر آج تک گذرے ہوئے لمحات کی یادیں باقی ہیں۔ دو سالوں سے ہم دونوں اپنے خاندان کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کی نیت کر چکے تھے۔ پچھلے سال بھی ایجنٹ سے بات کر لی تھی اور اس سال بھی ایجنٹ سے مسلسل رابطے میں تھے لیکن کرونا کی وجہ سے سعودی حکومت زائرین حج کو اجازت نہیں دے رہی ہے۔ انتقال سے چند روز قبل تک ہماری حج کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ ان کی نیت خالص تھی۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کو حج مبرور کا ثواب عطا فرمائے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے دیگر احباب کا تو مجھے علم نہیں، مگر میں خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہا ہوں اور اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ایک مخلص دوست اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔ یقیناً مخلص دوست کی رفاقت میں زندگی بڑی پرسکون اور خوشگوار گزرتی ہے اور اس کی فرقت میں زندگی کس قدر مشکل اور بے رونق رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر جب کہ دوست اس قدر مخلص، ہمدرد، غم گسار اور وفا شعار ہو۔ ہر لمحہ دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، میرے اور میرے اہل وعیال کے دل کو بھی صبر وسکون عطا فرمائے، آمین۔

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

شہیدِ کورونا

ماموں جان: پروفیسر اشتیاق دانش

ڈاکٹر محمد ارشد

ہم جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس نے خطرناک وبائی امراض کے بارے میں صرف سنا تھا، ان سے گزری نہیں تھی۔ بڑے بوڑھوں سے صرف سنتے آئے تھے کہ طاعون کی وبا پھیلتی تھی اور گھر کے گھر بلکہ آبادیاں کی آبادیاں انسانوں سے خالی ہو جایا کرتی تھیں۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سال میں ہماری نسل نے بھی ایک بڑی وبائی بیماری کا سامنا کیا جو کووڈ ۱۹ کے نام سے موسوم ہوئی۔ دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں لوگ اس جان لیوا وبائی بیماری کی زد میں آئے اور لاکھوں نے اس میں اپنی جان گنوائی۔ ہندوستان میں کورونا نے اپنے پاؤں پسارے تو خلق کثیر اس سے متاثر ہوئی۔ اول وہلہ میں ہی لاکھوں لوگ متاثر ہو گئے البتہ اس سال کے اوائل میں جب یہ امید ہو چلی تھی کہ شاید اس وبا کا بدترین دور گزر چکا ہے تو اچانک ہی اس وبا کی دوسری لہر نے آلیا اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو اپنا شکار بنایا۔ ماموں جان پروفیسر اشتیاق دانش بھی بالآخر کورونا کی اس دوسری لہر کا شکار ہو کر ۱۶۔ اپریل ۲۰۲۱ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ہمارے لیے ان کی موت اچانک اور ناگہانی ضرور لگتی ہے لیکن اللہ سبحانہ تعالی نے ان کے لیے اتنی ہی عمر مقرر کر رکھی تھی اور ہم اس پر راضی ہیں۔

خاندانی پس منظر

مشرقی اتر پردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے صدر مقام سے اتر جانب تقریبا دس کلومیٹر پر پٹھانوں کی ایک بستی نصیر پور کے نام سے آباد ہے۔ اس کی آبادی کا قصہ یہ ہے کہ قصبہ مبارک پور سے قریب پٹھانوں کی ایک آبادی سکٹھی کے نام سیآباد ہے، وہیں کے باشندہ دو بھائیوں کو ان کی بہادری کے صلے میں علاقے کے راجہ نے نصیر پور کا علاقہ بطور انعام عطا کیا تھا اور انہیں میں سے ایک کے نام (نصیر خاں) پر گاؤں کا

نام نصیر پور پڑا۔ یہ گاؤں تب سے اب تک اپنی سادگی، بے باکی اور بہادری کے لیے اطراف و جوانب میں مشہور ہے۔ پروفیسر اشتیاق دانش کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ وہ یہیں ۱۳۔فروری ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں بہادری کے ساتھ دینی تعلیم بھی عام تھی، دادا، پردادا اور تایا وغیرہ جون پور کے مدارس کے فیض یافتہ تھے۔ان کے والد حاجی محمد حسین خاں ایک متوسط درجے کے زمین دار تھے۔زمینوں کی آمدنی سے گزر بسر ہو جاتی تھی اس لیے انہیں وطن سے باہر روزگار کی تلاش میں جانے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی۔ان کی کوشش رہی کہ وہ اپنی اولاد میں سبھی کو تعلیم یافتہ بنائیں اور ان کے لیے جتنا اس زمانے میں ممکن تھا اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کیا بھی۔ان کی دس اولاد میں سے چار بیٹیوں اور چھ بیٹوں میں سبھی نے روایتی تعلیم حاصل کی ان میں سے دو نے عصری تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم بھی پائی۔البتہ خاندان کی تعلیمی و علمی روایت کا وافر حصہ ان کے آٹھویں نمبر کے بیٹے ماموں جان پروفیسر اشتیاق دانش کے حصے میں آیا۔

نانا مرحوم (محمد حسین خاں، والد پروفیسر اشتیاق دانش مرحوم) بتایا کرتے تھے کہ ان کے بڑے بھائی جنہوں نے ان کی پرورش کی تھی، کے تمام بچے طاعون کی ایک ہی وبا کا شکار ہو کر وفات پا گئے تھے۔بچوں میں صرف نانا مرحوم بچ رہے تھے، جو اپنے بھتیجوں کے ہی ہم عمر تھے۔یہی وجہ تھی کہ جب نانا مرحوم کی تعلیم کا معاملہ درپیش ہوا تو ان کی بھابھی نے تعلیم کے لیے انہیں شیراز ہند جون پور بھیجنے سے صاف صاف منع کر دیا۔نانا مرحوم کے والد اور سبھی بھائی جون پور کے مدارس دینیہ کے تعلیم یافتہ تھے،البتہ نانا مرحوم کی تعلیم واجبی سی اس لیے رہ گئی کہ ان کی بھابھی انہیں خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔نانا مرحوم کو حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کا بیشتر حصہ زبانی یاد تھا اور ہم لوگوں کو بھی وہ شاہنامہ ترنم کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔انہوں نے شاہنامہ اسلام اپنی سبھی بیٹیوں کو جہیز میں دے رکھا تھا، میری والدہ کو بھی شاہنامہ کا بہت بڑا حصہ یاد تھا اور ہم والدہ سے بطور لوری اسے سنا کرتے تھے۔

تعلیم

ماموں جان نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کرنے کے بعد، علاقے میں اس زمانے کے ابھرتے ہوئے تعلیمی ادارے جامعۃ الفلاح کا رخ کیا جو ان کے گاؤں سے ایک ڈیڑھ کلو میٹر کی دوری پر بلریا گنج قصبے میں واقع ہے۔ یہاں پر انہوں نے ثانوی درجات اور پھر عالمیت وفضیلت کی تعلیم حاصل کی۔وہ ۱۹۷۹ء میں جامعۃ الفلاح سے فارغ ہوئے۔ ان سے پہلے ان کے بڑے بھائی (ریاض ماموں) اعظم

گڑھ میں شبلی نیشنل کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں بغرض تعلیم داخلہ لے چکے تھے، البتہ علی گڑھ انہیں راس نہیں آیا اور وہ اعظم گڑھ واپس آ گئے اور یہیں اپنی بقیہ تعلیم مکمل کی۔ ماموں کے جامعۃ الفلاح سے عالمیت اور فضیلت مکمل کرنے تک فارغین مدارس کے لیے عصری درس گاہوں میں حصول تعلیم کی راہیں، جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) کی مساعی سے ہموار ہو چکی تھیں۔ جامعۃ الفلاح ان اولین مدارس میں شامل ہے جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ساتھ الحاق کیا۔ اس لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ماموں کے ارمانوں کی بھی خلد بریں بن گئی۔

ماموں جان کو اپنے نام کی مناسبت سے بچپن سے ہی علم کا بہت زیادہ اشتیاق تھا۔ والدہ اب بھی ان کے شوق علم کے قصے ہمیں سناتی ہیں۔ درسی مطالعے کے ساتھ غیر درسی مطالعے کا شوق انہیں بچپن سے ہی تھا، یہ شاید انہیں نانا مرحوم سے ورثے میں ملا ہوگا کیوں کہ نانا مرحوم بھی عبدالحلیم شرر کی کتابیں اور صادق حسین سردھنوی کے ناول بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ماموں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پڑھائی کے لیے گھر چھوڑ کر باغ میں چلے جایا کرتے تھے، ان کی مستقل رہائش پھوپھی کے گھر میں تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اور ان کا گھر نسبتاً پرسکون رہتا تھا۔ گھر میں پڑھائی کے دوران مختلف وجوہ سے انہیں حرج ہوتا تھا اس لیے کھانے یا کسی کام کے علاوہ اوقات میں انہیں گھر میں کم دیکھا جاتا تھا۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے کھیتوں کے بیچ بیٹھ کر پڑھائی کیا کرتے تھے۔ گاؤں کی عیدگاہ کا صحن بھی ان کے مطالعے کا ایک اہم مرکز تھا۔ ان کے شوق مطالعہ اور علم سے دل چسپی کا معاملہ یہ تھا کہ ماموں جان کے علی گڑھ چلے جانے کے کئی برس بعد جب ہمیں کچھ شد بد آئی تو نور، الحسنات، الفرقان، تجلی، پاسبان وغیرہ رسالوں کے ساتھ گلستان و بوستاں اور دیگر درسی و غیر درسی کتابوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہمارے ہاتھ لگا، ماموں جان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کلیلہ دمنہ (جو ان دنوں نایاب تھی اور عام طور پر طلبہ اسے نقل کر لیا کرتے تھے)، دیوان الحماسہ کے اشعار اور قرآن مجید کے تفسیری نوٹس بھی ہمارے ہاتھ لگے اور درسی دوستوں میں ہماری اہمیت کا سکہ بٹھانے میں بھی معاون ہوئے۔

ماموں جان جامعۃ الفلاح میں تعلیم کے دوران ہی طلبہ تحریک اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا سے وابستہ ہو چکے تھے۔ جامعۃ الفلاح میں ان کے قیام کے آخری دنوں میں ہی انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا قیام عمل میں آیا تو اس میں بھی ماموں جان پیش پیش رہے تھے۔ جامعۃ الفلاح سے علی گڑھ کے لیے رخت

سفر باندھا تو ان کا ایک حلقہ بن چکا تھا، یہاں تعلیم کے ساتھ وہ طلبہ تحریک کی سرگرمیوں خاص طور پر اس کے آرگن پہلے خبر نامہ اور پھر اسلامک مومنٹ کے ایڈیٹر رہے۔ سابق صدر ایس آئی ایم سید قاسم رسول الیاس نے جب افکار ملی نکالا تو اس میں بھی ماموں کے مضامین پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ اسی طرح علی گڑھ کے ان کے ایک دوست پروفیسر راشد شاذ نے جب ملی ٹائمز کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا تو اس کے بین الاقوامی صفحات بیشتر ماموں جان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا اور ہفت روزہ عالمی سہارا میں بھی مسلم دنیا اور عصری مسائل پر ان کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔ پہلے جامعۃ الفلاح کی علمی و مسلکی بے تعصبی اور پھر علی گڑھ کی علمی و تحریکی فضا نے ماموں جان کی شخصیت کی تشکیل میں بہت اہم رول ادا کیا ورنہ جس طرح کی آزاد طبیعت انہوں نے پائی تھی اس کے لیے روایتی تعلیمی اداروں کی قید و بند میں رہ پانا شاید مشکل ہو جاتا۔

چوں کہ مدرسے سے آئے تھے اس لیے علی گڑھ میں ماموں جان کا داخلہ عربی (آنرز) میں ہوا البتہ دوسرا مضمون انہوں نے انگریزی اختیار کیا اور پھر ایم اے انہوں نے انگریزی زبان میں کیا جو جامعۃ الفلاح سے فارغ کسی طالب علم کا انگریزی زبان میں شاید پہلا ایم اے تھا۔ علی گڑھ میں رہتے ہوئے انہوں نے انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ ان کے مضامین انگریزی زبان کے مشہور روزناموں The Times of India, The Hindu, Tthe Indian Express وغیرہ میں شائع ہونے لگے تھے۔ کسی مدرسے کے فارغ کے لیے یہ ایک بہت بڑی حصولیابی تھی۔ ماموں جان کا تعلیمی سفر یہیں نہیں تمام ہوا، مزید سیکھنے کا شوق انہیں مغرب میں برطانیہ لے گیا جہاں انہوں نے اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر میں بطور ریسرچ فیلو تقریباً ڈیڑھ برس (۱۹۸۴ تا ۱۹۸۶) کام کیا، اس دوران انہوں نے برطانیہ کے تعلیمی اداروں سے کچھ ڈپلوما کورسز بھی کرنے کی کوشش کی جو ان کے ہندوستان واپس لوٹ آنے کی وجہ سے شاید نامکمل ہی رہے۔ قیام برطانیہ کے دوران انہوں نے عیسائی مسلم تعلقات کا خصوصی مطالعہ کیا اور اسلامک فاؤنڈیشن سے شائع ہونے والے Periodical فوکس (Focus) کی ادارتی ذمہ داری بھی نبھائی جس میں عیسائی مسلم تعلقات پر اسلامی نقطہ نظر سے مضامین شائع ہوتے تھے۔ حالانکہ برطانیہ میں ہی مستقل طور پر قیام پزیر ہو جانے کے مواقع انہیں مل سکتے تھے البتہ انہوں نے تہذیب مغرب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان اپنے ملک کو ہی اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں گے۔ کئی لوگوں نے انہیں کہا بھی کہ کیا پاگل پن کر رہے ہو جو

مغرب میں رہنے کے مواقع کو چھوڑ کر واپس ہندستان لوٹ رہے ہو؟ بہر حال ماموں جان ارادے کے پکے اور بات کے دھنی تھے، ہندوستان لوٹے، علی گڑھ کے مرکز برائے ایشیائے غربی میں ایم فل میں داخلہ لیا، کم ترین مدت جو ایم فل کے لیے ہوسکتی تھی اس میں جان فلبی پر ایم فل کا مقالہ لکھا، بعدازاں اسی مرکز سے مغرب کے مشنری اور حکومتی زائرین عرب کے سفرناموں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے استاد پروفیسر مسعود الرحمان خاں کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے تھے، انہیں والد کا درجہ دیتے تھے، شادی کے بعد وطن اعظم گڑھ سے واپس لوٹے تو اہلیہ کو لے کر علی گڑھ استاد سے ملنے گئے۔ پروفیسر مسعود الرحمان خاں صاحب بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

عملی زندگی

ماموں جان کی طبیعت، خاندانی پس منظر اور تعلیم و تربیت نے انہیں نمونہ اسلاف بنا دیا تھا۔ وہ خود بہت سادہ تھے، دل کے بہت ہی صاف تھے کسی کے خلاف کسی طرح کا بغض و کینہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ صاف گوئی کا یہ عالم تھا کہ وقت کے جابروں کے سامنے بھی اظہار حق سے ذرا بھی نہیں گھبراتے تھے۔ حالانکہ اس حق گوئی کی قیمت بھی انہیں بار بار چکانی پڑی۔ ان کی حق گوئی نے انہیں علی گڑھ میں ٹکنے نہیں دیا۔ تقریبا تین برس (۱۹۹۰ تا ۱۹۹۳) تک علی گڑھ کے مرکز برائے ایشیائے غربی میں عارضی تدریس کے باوجود وہ یونی ورسٹی میں تدریس کی ''ضروریات'' سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے اور ایک طرح سے یونی ورسٹی میں ملازمت کے دروازے ان پر بند ہو گئے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صلاحیت خود کو منوا لیتی ہے۔ ان کے اندر ایک بہترین محقق، ایک بے مثال استاد اور ایک عمدہ ایڈیٹر موجود تھا۔ علی گڑھ نے اپنے دروازے ان پر بند کر لیے تو انہوں نے علی گڑھ سے باہر کی دنیا میں قدم رکھا کیونکہ Compromise وہ کر نہیں سکتے تھے اور صرف اہلیت کی بنیاد پر انہیں علی گڑھ میں ملازمت مل نہیں سکتی تھی۔ باہر نکلے تو کامیابی اپنا دامن پھیلائے ان کے سامنے کھڑی تھی، خلیج کے کسی ملک، IndianExpress اور جامعہ ہمدرد میں لکچر شپ تین مواقع تقریبا ایک ہی وقت میں انہیں ملے، علم کا انہیں شوق تھا، ملک و قوم سے محبت تھی، جامعہ ہمدرد کی لکچر شپ میں انہیں اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مزید امکانات نظر آئے انہیں لگا کہ ایک خود مختار تعلیمی ادارے میں تحقیق و تدریس کے ساتھ رائے کے اظہار کی آزادی بھی حاصل ہوگی چنانچہ انہوں نے ہمدرد میں لکچر شپ جوائن کر لی۔ یہیں پہلے ریڈر بنے اور پھر پروفیسر۔ جامعہ ہمدرد میں بطور لکچرر ان کے انتخاب کی ایک اہم وجہ انہیں دنوں The

Times of India میں شائع ہونے والا ان کا ایک مضمون تھا جسے اس وقت کے جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر رشید الظفر صاحب نے پڑھا تھا اوراس سے متاثر بھی تھے۔

پروفیسر اشتیاق دانش کے لیے جامعہ ہمدرد بھی ایک روایتی عصری تعلیمی ادارہ ہی ثابت ہوا۔ اس طرح کے اداروں میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے ارباب اختیار سے قربت کی جو صلاحیت عموما درکار ہوتی ہے وہ ان میں تھی نہیں اس کے برعکس اکثر وہ اپنی صاف گوئی میں ایسی باتیں کہہ جاتے جن سے اصحاب اختیار کے ماتھے پر بل پڑتے ہیں۔ البتہ جامعہ ہمدرد میں کئی وائس چانسلر ایسے آئے جنہیں پروفیسر دانش کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا، سابق وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین، جنہوں نے انہیں ریڈر بنایا تھا، کو میں نے خود دیکھا کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ پروفیسر اشتیاق دانش ایک سیمینار میں پٹنہ آئے ہوئے ہیں تو انہیں بلا کر بڑے ہی والہانہ انداز میں ان سے ملے، ان کی تعریف کرتے رہے، دعائیں دیتے رہے اوران کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ اسی طرح جامعہ ہمدرد کے ایک اور وائس چانسلر سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے، ان وائس چانسلر صاحب نے جامعہ ہمدرد کی علمی سرگرمیوں میں تیزی لانے، اس کے تعارف کو وسیع کرنے اوراسے ایک متحرک (Vibrant) ادارے کے طور پر پیش کرنے کے لیے پروفیسر اشتیاق دانش کا بھرپور استعمال کیا اور پروفیسر دانش نے بھی خوب جی لگا کر کام کیا لیکن اتنی قربت اوراتنے کام کے باوجود بھی پروفیسر دانش کی غیرت نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا کہ اپنے لیے ان سے کبھی کچھ مطالبہ کرتے یہاں تک کہ پروفیسر شپ جس کے کہ وہ مستحق تھے، اس کا مطالبہ بھی انہوں نے ان سے نہیں کیا، جس کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ آیندہ کئی برسوں تک ان کی پروفیسر شپ معلق رہی۔

پروفیسر اشتیاق دانش کو جو لوگ جانتے ہیں انہیں پتا ہوگا کہ وہ عام طور پر اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی زیادہ تر توجہ تعلیم و تدریس اور علم و تحقیق کے کاموں پر رہتی تھی۔ انہوں نے جامعہ ہمدرد کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں علمی و تحقیقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی، ایم اے اور بعد ازاں بی اے کی تعلیم شروع کروانے میں بھی ان کا کلیدی رول رہا، اس حوالے سے جامعہ ہمدرد کے اس وقت کے چانسلر جناب سید حامد کی ایما پر اسلامک اسٹڈیز کا ایک مثالی نصاب تعلیم بھی انہوں نے تیار کیا، اس مضمون میں کئی نئے پرچے انہوں نے متعارف کرائے جو آگے چل کر دوسری یونی ورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامک اسٹڈیز کے لیے بھی رہنما ثابت ہوئے اورانہوں نے بھی اپنے نصاب میں ان پرچوں کو شامل کیا۔

جامعہ ہمدرد میں رہتے ہوئے پروفیسر اشتیاق دانش کو کئی بار شعبے کی سربراہی ملی، بطور صدر شعبہ انہوں نے اسلامک اسٹڈیز کے شعبے کو ترقی دینے کی بھرپور کوشش کی۔ شعبے کی لائبریری کے لیے کتابوں کی خریداری کے مقصد سے انہوں نے یونی ورسٹی سے خاص بجٹ حاصل کیا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جامعہ ہمدرد کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی لائبریری میں جدید اسلامی دنیا سے متعلق حوالہ جاتی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ دستیاب ہو گیا جس سے نہ صرف شعبے کے طلبہ اور اساتذہ کی تحقیقی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ دیگر جامعات کے طلبہ بھی اس سے ستفادہ کرتے ہیں۔ صدر شعبہ رہتے ہوئے ان کا واسطہ جامعہ ہمدرد کے انتظامی کاموں اور انتظامیہ سے بھی پڑا، اسی طرح اساتذہ اور دیگر کارکنوں کے حقوق و واجبات کے حوالے سے بھی شکایات وغیرہ ان تک پہنچتیں، اپنے مزاج کے مطابق وہ صاف گوئی کے ساتھ ان پر تبصرہ کرتے اور بوقت ضرورت یونی ورسٹی کے ذمہ داروں کو بھی اس جانب متوجہ کرتے۔ ان کے مطابق یونی ورسٹی میں ہونے والی بدعنوانی پر وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے، ان کا ماننا تھا کہ جامعہ ہمدرد ملت کا ایک ایسا سرمایہ ہے جس کو کھڑا کرنے میں اس کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا، وہ اسے ایک ایسے ادارے کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے جو ملک وملت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرے، اس لیے پروفیسر دانش اس ادارے کو نقصان پہنچانے والے کسی بھی اقدام پر اپنی رائے کے اظہار کو اپنے فرض منصبی کا حصہ سمجھتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے جامعہ ہمدرد کو اپنی دنیاوی ترقی اور مفادات کا زینہ سمجھنے والے بعض ارباب اختیار کے لیے ان کا یہ رویہ قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پروفیسر اشتیاق دانش اور ان کے جیسے خیالات کے حامل بعض دوسرے پروفیسروں کو اپنے راستے کا روڑا سمجھنے لگے یہاں تک کہ ایک سابق وائس چانسلر جو اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جامعہ ہمدرد کے سیاہ سفید پر قابض رہنا چاہتے تھے، انہوں نے ان کو اور ان کے دو ساتھیوں کو ایک ایسے الزام میں لازمی ریٹائرمنٹ دے دیا جس پر یقین کرنا پروفیسر دانش اور ان کے ساتھیوں کے مخالفین کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ پروفیسر دانش اور ان کے ساتھیوں کا اکیڈمک ریکارڈ ایسا نہیں ہے کہ ان کی خدمات کو جاری رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک فرضی رپورٹ بھی تیار کروائی گئی جس کا پردہ فاش ان کے انتقال سے کچھ دنوں پہلے ہوا۔

بہر حال بعد میں جامعہ ہمدرد کے ارباب اختیار کو یہ احساس ہوا کہ پروفیسر اشتیاق دانش اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ان کے معاملے کی تحقیق کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے پایا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی، قریب تھا کہ اس کی آخری میٹنگ کے بعد ان کی دوبارہ بحالی ہو جائے گی، چند

دنوں کی بات تھی لیکن قضاو قدر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ماموں جان اپنی بحالی کو لے کر بے انتہا خوش تھے اپنے قریبی لوگوں اور دوستوں کو فون کر کے انہوں نے اطلاع دی تھی کہ ان کے ساتھ جو ناانصافی اور زیادتی تقریبا پانچ برس پہلے ہوئی تھی اس کا ازالہ ہو گیا ہے اور وہ بہت جلد جامعہ ہمدرد کو دوبارہ جوائن کرنے والے ہیں، سبھی خوش تھے اور یہ توقع تھی کہ ایک بار پھر ان کے علمی فیض سے طلبہ اور محققین کو باضابطہ استفادے کا موقع ملے گا اور ان کے کئی منصوبے جو جامعہ ہمدرد کی شہرت اور نیک نامی میں چار چاند لگا سکتے تھے وہ بھی پورے ہوں گے۔ انسان اپنے منصوبے اور ارادے رکھتا ہے اور اس کا مالک اس کے لیے کچھ اور فیصلہ کیے ہوئے ہوتا ہے، ماموں جان کے ساتھ بھی یہی ہوا دنیوی کامیابی بظاہر سامنے کھڑی تھی اور قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوا کہ اے نفس مطمئنہ چل اپنے رب کی طرف راضی بہ رضا۔

علمی سرگرمیاں

ماموں جان پروفیسر اشتیاق دانش کو علم کا شوق بچپن سے تھا، ان کا یہ شوق تاعمر برقرار رہا یہاں تک کہ بیماری کے سبب اسپتال منتقل ہونے والے دن تک ان کی علمی سرگرمیاں جاری تھیں۔ دوران طالب علمی ان کے مضامین حیات نو، خبر نامہ اور اسلامک موومنٹ میں شائع ہوتے رہے۔ ایس آئی ایم کے آرگنس خبر نامہ اور اسلامک موومنٹ کے وہ مدیر بھی رہے۔ افکار ملی، ملی ٹائمز، راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا میں کثرت سے ان کے مضامین شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ انگریزی روزناموں اور ہفت روزہ رسائل میں بھی انہوں نے مضامین لکھے مثلا The Times of India, Indian Express, The Hindu, Frontline, Nation and the World, Radiance, وغیرہ۔

بلاشبہ علمی دنیا میں اسلامک اسٹڈیز کے حوالے پروفیسر اشتیاق دانش کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے جدید مسلم دنیا کا بہت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، انیسویں صدی عیسوی کی مسلم دنیا کے سیاسی امور پر ان کی گہری نظر تھی۔ مسلم دنیا کے انتشار و اختلاف میں مغربی استعماری طاقتوں کے رول اور ان کے طریقہ کار پر انہوں نے تحقیقی کام کیا تھا اس لیے وہ موجودہ عرب دنیا، اس کے حکمرانوں، مسئلہ فلسطین، ترکی، مصر اور ایران وغیرہ کی حالیہ تاریخ و سیاست پر بہت ہی سوچی سمجھی رائے رکھتے تھے اور ان موضوعات پر ان کی مہارت کو علمی حلقوں میں تسلیم بھی کیا جاتا تھا۔ تحقیقی کام پر مبنی ان کی پہلی کتاب The English and the Arabs:The Making of an Image ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے

مشنری اور برطانوی استعمار کے ایجنٹ کے طور پر عرب دنیا میں کام کرنے والے زائرین کے سفرناموں کے حوالے سے ان کے ان کرتوتوں کو واضح کیا ہے جو مسلم دنیا کے شیرازے کو بکھیرنے کے لیے کیے گئے۔

دہلی میں رہتے ہوئے پروفیسر اشتیاق دانش نے یونی ورسٹی کی علمی سرگرمیوں کے علاوہ خود کو ہندوستانی مسلمانوں کے واحد تھنک ٹینک ادارے انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) سے وابستہ کیا۔اس کی علمی سرگرمیوں میں شرکت کے علاوہ متعدد انتظامی مجالس کا بھی حصہ رہے۔ وہ ایک طویل عرصے سے آئی او ایس کی سرگرمیوں کے خبرنامے IOS News Letter کے مدیر تھے۔اس نیوز لیٹر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں آئی او ایس کی سرگرمیوں کے ذکر کے ساتھ پہلے صفحے پر کسی اہم کتاب کا اقتباس اور آخری صفحے پر Opinion کے نام سے ایک مختصر مضمون عصری مسائل پر شائع ہوتا ہے۔ Opinion پابندی کے ساتھ پروفیسر اشتیاق دانش لکھا کرتے تھے۔ان مضامین کا ایک مجموعہ Opinion on Issues, Events and Ideas کے نام سے ۲۰۱۸ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز سے شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر اشتیاق دانش گزشتہ کئی سالوں سے آئی او ایس کے علمی جرنل Journal of Objective Studies کے بھی مدیر تھے۔

پروفیسر اشتیاق دانش کی ایک اور علمی کتاب The Ummah, Pan-Islamism and Muslim Nation State ہے۔ یہ کتاب بھی انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں اسلام کے تصور امت، اتحاد اسلامی اور جدید قومی ریاستوں کے تصورات پر علمی انداز میں بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر اشتیاق دانش کو مسلم نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے امور مسائل سے خاص دل چسپی تھی۔ چوں کہ بحیثیت استاد ان کا براہ راست واسطہ نوجوان طلبہ اور اسکالرس سے رہتا تھا، اس لیے وہ ان کے مسائل پر مستقل غور و فکر کیا کرتے تھے۔اس غور و فکر کے نتیجے میں ان کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں، ایک Empowerment of Muslim Youth in India اور دوسری Chalenges before Youth in Contemporary World ۔ یہ دونوں کتابیں بالترتیب ۲۰۰۴ء اور ۲۰۱۹ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز سے شائع ہوئیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور انہیں وسعت دینے کے لیے دیگر علمی پروجکٹس کے ساتھ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر قومی و بین الاقوامی سطح کے سیمینار بھی منعقد کرتا ہے۔

پروفیسر اشتیاق دانش کا رول ان سیمیناروں کے انعقاد میں کلیدی نوعیت کا ہوتا تھا اوران میں سے کئی سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالات کو انہوں نے مرتب کر کے شائع کیا مثلا Indian Muslim Status and Future سال ۲۰۱۸ء، The Legacy of Muhammad Hamidullah سال ۲۰۲۰ء، ''ہندوستان کا مستقبل اور اسلام''، سال ۲۰۲۱ء، ان کی ایک اور کتاب آئی او ایس کے زیر اہتمام منعقد فواد سیزگن سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات پر مشتمل زیر طبع ہے۔ ''ہندوستان کا مستقبل اور اسلام'' دراصل ہندوستانی مسلمانوں کو موجودہ دور میں درپیش خطرات ومسائل کو سمجھنے اوران کے تدارک کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے کے حوالے سے جودھ پور راجستھان میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس سیمینار کی ایک خاص بات یہ تھی کہ موضوع پر اسلامک اسٹڈیز کے حوالے سے غور و فکر ہونا تھا اور اسی لیے اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ وطلبہ کی ایک تعداد نے اس سیمینار میں شرکت کی تھی۔ اس کتاب کی علوم اسلامی کے طلبہ کے لیے خاص اہمیت یہ ہے کہ اس میں پروفیسر اشتیاق دانش نے اسلامک اسٹڈیز کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے اس مضمون کی تاریخ اوراہمیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اسے مزید وسعت دے کر مستقل کتابی شکل بھی دینا چاہتے تھے، جو شاید اب ممکن نہیں رہا۔

پروفیسر اشتیاق دانش کا بنیادی میدان عمل جامعہ ہمدرد رہی۔ ہمدرد سے ان کی وابستگی دو دہائیوں سے زیادہ رہی اس دوران انہوں نے وہاں تدریس کے علاوہ تحقیق کے طلبہ کی نگرانی اور مختلف علمی پروجکٹس پر کام کیے۔ انہوں نے بی اے اور ایم اے کے طلبہ کو جدید مسلم دنیا، عصری مسائل اور مسلمانوں کی علمی و تحقیقی مساعی جیسے مضامین پڑھائے، تقریبا ڈیڑھ درجن اسکالرس کو ریسرچ کرائی، پچاس سے زیادہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کو جانچنے اور زبانی امتحان لینے کا کام کیا۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی اسلامک اسٹڈیز سے متعلق مختلف کمیٹیوں کے رکن رہے خاص طور پر NET کے نصاب کی تیاری میں ان کا اہم کردار رہا۔ جامعہ ہمدرد میں حکیم عبدالحمید صاحب کے ایک موقر پروجکٹ جس کے تحت مشہور فلسفی وطبیب بوعلی سینا کی طبی کتاب القانون فی الطب کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہونا تھا، کتاب کی تیسری ضخیم ترین جلد کے ترجمے کی نگرانی ورہنمائی کی۔ اسی طرح جب ہمدرد میں سینٹر فار اسٹڈیز آن انڈین مسلمس قائم ہوا تو اس کے سربراہ کے طور پر سینٹر کے دو پروجکٹس، ''تعلیم کے فروغ میں درگاہوں کا رول'' اور ''مدارس کے بارے میں فارغین مدارس کے تاثرات'' انہیں کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچے۔ انہوں نے سچر کمیٹی کے لیے مسلمانوں کے دینی مدارس پر ایک

رپورٹ بھی تیار کی ، اسی طرح یونیسیف لکھنو کے لیے مسلمان لڑکیوں کے تعلیم ادھوری چھوڑ دینے پر ایک سروے رپورٹ تیار کی۔ دہلی میں قائم جاپان فاؤنڈیشن کی درخواست پر انہوں نے ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون اوران سے متعلق اداروں کے تعارف پر مبنی ایک طویل تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا بعد میں فاؤنڈیشن نے اس مقالے کو کتابی شکل میں Islamic Studies in India کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع بھی کیا۔ جامعہ ہمدرد سے ایک علمی مجلّہ Studies in Islam کے نام سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے شائع ہوتا تھا جو بعد میں بند ہوگیا، پروفیسر اشتیاق دانش نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے تحت اس علمی مجلّے کا احیاء ۲۰۰۴ء میں Studies on Islam کے نام سے کیا، وہ تین برس تک اس کے ایڈیٹر رہے البتہ بعد میں بعض وجوہ سے یہ مجلّہ بھی جاری نہیں رہ سکا۔

پروفیسر اشتیاق دانش نے مختلف موضوعات پر کئی درجن علمی مقالات لکھے جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں البتہ یہ ذکر شاید مناسب ہو کہ ان مقالات میں مغربی ایشیا کی سیاست اور امور ومسائل کے علاوہ ایک بڑی تعداد ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش چیلنجز اور مسائل سے متعلق ہے۔ انہوں نے ان میں ہندوستانی مدارس میں ان کے بنیادی کردار کو برقرار رکھتے ہوئے مناسب اور ضروری اصلاح کی تجاویز پیش کیں۔ فارغین مدارس کو کس طرح مین اسٹریم میں شامل کیا جاسکتا ہے، اس کا لائحہ عمل پیش کیا۔ حاشیے پر پڑے ہندوستانی مسلم معاشرے کو کس طرح ایک فعال اور متحرک معاشرے میں بدلا جاسکتا ہے اس پر بات کی۔ اس صدی کے ابتدئی برسوں میں جب ایک بار پھر بعض عدالتی حلقوں سے قرآن مجید کی کچھ آیات پر اعتراضات وارد ہوئے تو دفاع اسلام میں انہوں نے ان قرآنی آیات کو ان کے اصل پس منظر میں پیش کرتے ہوئے انگریزی زبان میں ایک طویل تحقیقی مضمون Studies on Islam میں شائع کیا اور اس کو مختلف عدالتوں اور وکلاء کو بھیجنے کا اہتمام بھی کیا تاکہ قرآنی آیات کے بارے میں ان کی غلط فہمیوں کو دور کیا جاسکے۔ پچھلے چند برسوں کے دوران مسلمانوں کی علمی تحقیقات اور ایجاد واختراع پر مبنی ایک میوزیم اور لائبریری کے قیام جیسے اہم پروجکٹ پر کام کررہے تھے، اس حوالے سے انہوں نے ترک محقق فواد سیزگن کے کام کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ ترکی اور متحدہ عرب امارات کے سفر کے دوران اس حوالے سے ان ملکوں میں ہونے والے عملی کاموں کا انہوں نے مشاہدہ بھی کیا تھا۔ جامعہ ہمدرد کے بعض اہم اور صاحب اختیار ذمہ داران سے اس موضوع پر ان کی بات چیت بھی ہوچکی تھی اور توقع تھی کہ جامعہ ہمدرد دوبارہ جوائن کرنے کے بعد وہ اس اہم پروجکٹ کا عملا آغاز بھی

کر سکیں گے، لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور ان کے دیگر کئی منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

پروفیسر اشتیاق دانش شعر و ادب کا بھی بہت ہی ستھرا ذوق رکھتے تھے، انہوں نے شاعری بھی کی، نظمیں اور غزلیں لکھیں، آزاد شاعری میں بھی طبع آزمائی کی، انگریزی زبان میں ایک ناول The Arab Spring کے نام سے لکھا جو خاصا مقبول بھی ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے مسلم گھرانوں کو درپیش مغربی ثقافتی یلغار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کش مکش کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے البتہ ابھی تک ان میں سے کوئی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ ''شورِ خاموشی'' کے نام سے سال ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مجموعہ بھی بالکل تیار تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کے ڈراموں اور دوسرے شعری مجموعے کی اشاعت کی سبیل فرمائے۔ بظاہر انہوں نے اردو زبان میں کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ بھی خاصا ہے اور ان سے کئی کتابوں کا مواد تیار ہوسکتا ہے، ممکن ہے مستقبل میں اس طرح کی کچھ چیزیں منظرِ عام پر آسکیں۔

ماموں جان پروفیسر اشتیاق دانش ایک بھرپور شخصیت کے حامل تھے۔ وہ دوستوں کے دوست، رشتہ داروں اور اعزہ میں عزیز، اولاد و اہلِ خانہ کا ہر طرح خیال رکھنے والے، رفقاء اور ہم کاروں میں محترم اور اپنے طلبہ اور اسکالرس کے لیے شفیق و مہربان، ایک ایسے رہنما اور گائڈ جو ہر طرح کے تعصّبات و تحفظات سے اوپر اٹھ کر صرف اور صرف ان کی فلاح و بہبود کا خواہاں ہوتا ہے۔ اللہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، ان کی نیکیوں کا اجر دوچند کرے اور اعلیٰ علیین میں اپنے محبوب بندوں میں شامل کرے۔

مت سہل ہمیں جانو ، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

●●

طب یونانی کا روشن ستارہ غروب ہوگیا

(استاد محترم پروفیسر غفران احمد کی خدمات کا جائزہ)

ڈاکٹر شمشاد عالم

موت کا وقوع جتنا یقینی ہے، اس کا وقت اور مقام اتنا ہی غیر یقینی ہے۔ استاد محترم پروفیسر غفران احمد صاحب کا اس طرح سے اچانک دنیا سے رخصت ہو جانا یقیناً ہزاروں محبین کو شدید غمزدہ اور سوگوار کر گیا۔ موت برحق تھی اس کا وقوع ہوا لیکن کسے معلوم کہ اس کا وقت ۳۰/اپریل ۲۰۲۱ء بروز جمعہ بمطابق ۱۷/رمضان یعنی غزوۂ بدر کا مبارک دن متعین تھا اور زندگی کے بیشتر ایام سرزمین علی گڑھ میں گزارنے کے بعد بالآخر موت کے فرشتہ نے آپ کو اصل جائے وفات یعنی لکھنؤ منتقل کیا جو مقام لوحِ محفوظ میں درج تھا۔

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو

بے شمار اوصاف حمیدہ کے مالک اور ہزاروں دلوں میں بسنے والے استاد محترم پروفیسر غفران صاحب فرائض منصبی کے دوران ۱۲/اپریل ۲۰۲۱ء کو شیخ الجامعہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی ایک مجوزہ میٹنگ میں شریک ہوئے۔ گو کہ مذکورہ میٹنگ ان کے لئے بہت اہمیت کی حامل نہیں تھی پھر بھی عہدہ اور منصب کے احساس ذمہ داری نے طبعیت کی ناسازگی کے باوجود آپ کو اس میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ کر دیا اور وہی دن شعبہ میں ان کا آخری دن ثابت ہوا۔

میں اپنے آپ کو اس معنی میں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے انتہائی مشفق اور محسن استاد کے آخری ایام میں ان کی خدمت کا تھوڑا سا موقع نصیب ہوا۔ حالانکہ استاد محترم اگر صحت یاب ہو گئے ہوتے تو شاید میری خوشی دوچند ہو جاتی، مگر مشیت ایزدی تو کچھ اور ہی تھی۔ ۱۳/اپریل سے استاد محترم نے شعبہ کے فرائض سے رخصت لے لی اور گھر پر آرام کرنے لگے۔ اس دوران میں مستقل ان کے ربط میں تھا۔ ۱۷/اپریل تک جب بخار کی شدت میں کوئی خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا تو میں نے کہا: سر احتیاطاً ایک سینہ کی سی ٹی اسکین کرالیں۔

چنانچہ آپ اسکے لیے آمادہ ہوگئے۔سی ٹی اسکین کی رپورٹ اس وقت تسلی بخش تھی اس لیے کہ اس میں نمونیا کا اسکور صرف ۱۰ آیا تھا اور طبی اعتبار سے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی کوڈ۔۱۹ کے پروٹو کال کے مطابق پورا علاج چلتا رہا۔اس دوران آپ کافی مطمئن نظر آئے اور ہم لوگ بھی خوش تھے کہ اب ماشاء اللہ افاقہ ہو رہا ہے اور آپ بہتری کی طرف جارہے ہیں۔لیکن اس کے بعد کا منظر پھر ہمیں بے چینی اور تشویش کی طرف لے کر چلا گیا۔ جب کووڈ۔۱۹ کی رپورٹ مثبت آتی ہے، تبھی آپ سے کہا جاتا ہے کہ اب آپ کو کوڈ آئسولیشن وارڈ میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ سننا تھا کہ آپ پر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور آپ گھبرا گئے اور میرے پاس فون کیا شمشاد دیکھو اب مجھے کوڈ آئسولیشن وارڈ میں شفٹ کرنے کو کہا جارہا ہے، لہٰذا اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید اب میں نہیں بچ پاؤں گا۔تم براہِ کرم میری پنشن وغیرہ میری بیوی کے نام کرادینا۔ یہ سننا تھا کہ میرا بھی دل بھر آیا اور سوچنے لگا کہ استاد محترم یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے انھیں تسلی دی کہ سر پریشان نہ ہوں اس وارڈ میں بھی تمام سہولیات مہیا ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہم لوگ آپ کے پاس نہ ہوکر باہر رہیں گے، لیکن آپ اطمینان رکھیں۔ان شاء اللہ اب آپ دو تین روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔مگر آئسولیشن وارڈ میں داخل ہونا ہی انھیں قضاء الٰہی سے قریب تر کر دیا۔۲۴ر گھنٹے کے دوران ہی آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ان کی تشویشناک حالت کو دیکھتے ہوئے آپ کے برادر نسبتی پروفیسر کوثر عثمان صاحب جو کہ کے جی ایم یو، لکھنؤ میں شعبۂ میڈیسن کے سربراہ بھی ہیں، انھوں نے علی گڑھ میں موجود اپنے دو بھائیوں سے کہا: غفران صاحب کو فوراً لکھنؤ لے کر آجائیں۔ چنانچہ انھیں ایمبولینس کے ذریعہ لکھنؤ لے جایا گیا اور وہاں پہنچتے ہی آپ کی خراب حالت کو دیکھتے ہوئے آپ کو وینٹیلیٹر پر ڈال دیا گیا اور حتی الامکان زندگی بچانے کی تمام تر کوششیں کی گئیں، لیکن آخر میں وہی ہوا جس کے لیے نا تو دل آمادہ تھا اور نا ہی دماغ تیار تھا۔۳ روز تک موت وزیست کی کشمکش کے بعد بالآخر ۳۰ راپریل ۲۰۲۱ کو صبح نو بجے ۵۶ رسال کی عمر میں آپ اس دارفانی سے دنیائے جاودانی کی طرف ہمیشہ ہمیش کے لیے کوچ کر گئے اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

جانا تو ہے سبھی کو اک روز اس جہاں سے
تجھ کو خدا نے شاید جلدی بلا لیا ہے

ولادت اور تعلیم وتربیت

یونانی طب کے نقیب اور کثیر الجہات اوصاف کے حامل استاد محترم جناب غفران احمد صاحب کی پیدائش ضلع اعظم گڑھ کے ایک علمی اور مذہبی خانوادہ میں ۲۵ ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو ہوئی۔ان کا آبائی وطن مشہور قصبہ

بلریا گنج سے متصل ایک گاؤں چھپیں میں تھا۔ بعد میں آپ کے والد محترم مستقل سکونت کی غرض سے محمد آباد گوہنہ تشریف لے گئے جو کہ اُس وقت اعظم گڑھ ضلع میں ہی تھا، لیکن اب وہ علیحدہ ہوکر مئو ضلع میں آ گیا ہے۔ آپ کا نانیہال بھی بلریا گنج کے پاس ہی ایک گاؤں بصیر پور میں ہے۔آپ کے والد ماجد جناب مسعود احمد صاحب مرحوم برطانوی حکومت میں ملازم تھے ان کا تقرر گورنمنٹ ہاسپٹل میں فارماسسٹ کے عہدہ پر ہوا تھا۔آپ کے والد محترم بھی ایک نہایت شریف النفس اور خوش طبع شخص تھے جیسا کہ لوگوں کا کہنا ہےاور خود استاد محترم کے برادران بتاتے ہیں کہ غفران کے اندر کافی حد تک والد محترم کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔آپ کے والد محترم کا شمار علاقہ کی چند معروف شخصیات میں ہوتا تھا۔آپ جماعت اسلامی سے بھی جڑے ہوئے تھے اوراس کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے تحریک کا کام بھی بہت تندہی سے کیا کرتے تھے۔حسن اتفاق سے آپ کے والد کا نام مرحوم جناب مسعود احمد تھااور والدہ کا نام مرحومہ مسعودہ خاتون تھا۔آپ کی والدہ مرحومہ بھی بہت ہی نیک اور دین دار خاتون تھیں۔والدہ محترمہ تو پہلے ہی ۴؍اپریل ۱۹۹۷ء کو ۷۴؍سال کی عمر میں وفات پا چکی تھیں، جب کہ والد محترم کا انتقال ۱۱؍اکتوبر ۲۰۱۷ء میں ۹۸؍سال کی عمر میں ہوا۔

آپ نے ابتدا سے پورے جذبے اور محنت کے ساتھ اپنی تعلیمی سفر کو آگے بڑھایااور ہمیشہ امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے۔آپ شروع سے ہی اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے اور ایک محنتی طالب علم کی حیثیت سے اساتذہ اور رفقاء کے درمیان بے حد مقبول تھے۔اپنے اساتذہ کا احترام اوران سے عقیدت ان کی عادت میں شامل تھا جس کا زندگی کے آخری ایام تک ہم لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ چوں کہ شروع سے ہی پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے اوراپنے ہم عصر طلباء ساتھیوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھتے تھے، لہٰذاان کے درمیان بھی کافی محبوب تھے۔ ہاسٹل میں آپ کا معمول تھا کہ صبح فجر سے پہلے بستر چھوڑ دیتے تھےاور ضروریات سے فارغ ہوکر لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔آپ کو درسی کتب کے ساتھ ساتھ غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا بھی بہت شوق تھا۔دوران طالب علمی دیگر محنتی اور پوزیشن ہولڈر طلباء کے مابین دلچسپ مقابلہ رہتا تھا۔اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر نام جناب عبدالحئ فاروق صاحب بریلی کا معلوم ہوا ہے۔آپ کے کچھ ساتھیوں نے بتایا کہ کلاس میں کبھی غفران صاحب کی اول پوزیشن ہوتی تھی تو کبھی عبدالحئ صاحب کا پہلا نمبر ہوا کرتا تھا۔اس کے لیے دونوں ساتھیوں میں خوب مقابلہ رہتا تھا۔آپ کے اور کچھ دیگر فلاحی ساتھی جو کہ اس وقت مختلف جگہوں پر ملازمت کر رہے ہیں یا اپنے بزنس میں مشغول ہیں۔سب کا نام تو درج کرنا مشکل ہے،

مگران میں سے چنداں ناموں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔مثلاً جناب محمد احمد صاحب، جناب محی الدین ساجد صاحب، دونوں حضرات اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر جلیس احمد صاحب جو کہ پونہ میں ایک یونانی کالج میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔جن اساتذہ سے آپ نے زانوئے تلمذتہہ کیا تھا، ان کی فہرست تو کافی طویل ہے مگران میں سے چند نمایاں قابل ذکراساتذہ کے نام اسطرح ہیں۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ،مولانا شبیراحمد اصلاحیؒ،مولانا صغیر حسن اصلاحیؒ،مولانا نظام الدین اصلاحیؒ اور ماسٹر عبداللہ صاحب۔ان اساتذہ نے آپ کو دینی وعصری تعلیم سے مزین کیااورآپ کی بہترین آبیاری کی۔

اس طرح آپ کی ابتدائی،ثانوی اور پھراعلیٰ تعلیم کا سفر۲۳ رفروری ۱۹۸۳کو پایۂ تکمیل کو پہنچااور پھرآپ نے عالمیت کی سند کے ساتھ مزید اعلیٰ تعلیم کی جستجو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رُخ کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ

پروفیسر غفران صاحب جامعۃ الفلاح سے عالمیت سے فراغت کے بعد علی گڑھ آ گئے اورآپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۸۳ میں پہلے بی۔اے(اکنامکس)میں داخلہ لیا اور امتیازی نمبرات سے گریجویشن مکمل کیا۔اس وقت مدارس کے طلباء بی۔اے کے تمام ہی کورسیز میں میرٹ کے اعتبار سے براہ راست داخلے کے لیے اہل ہوتے تھے۔ دورانِ طالب علمی آپ کا قیام وقارالملک (وی ایم ہال) کے جوبلی ہوسٹل میں تھا۔ غفران صاحب نے اپنے گریجویشن کے دوران کا ایک واقعہ سنایا جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔آپ نے بتایا کہ لوگوں کا یہ ایک عام نظریہ اورسوچ ہے کہ مدارس کے طلباء کی انگریزی زبان پر گرفت کم ہوتی ہے،لہٰذا وہ کسی ایسے مضمون میں جوخصوصاً انگریزی میں ہو،ان کے لیےاس میں کامیابی مشکل ہے۔یہی سوچ یہاں کے بھی کچھ اساتذہ کی تھی۔ چنانچہ جب غفران صاحب اوران کے کچھ رفقاء نے اکنامکس کواپنا اصل مضمون منتخب کیا تو اس وقت اکنامکس کے ایک نامور استاد نے ان لوگوں کو بلا کر سمجھایا کہ تم لوگ مدرسہ سے فارغ ہو، اکنامکس میں داخلہ کیوں لے لیا ہے؟ یہ تو انگریزی زبان میں ہوتی ہے اورامتحانات وغیرہ بھی اسی زبان میں ہوتے ہیں، جوتم لوگوں کے بس کی نہیں ہے۔لہٰذا ابھی شروعات ہے اسے تبدیل کرلواور کسی دوسرے مضمون جیسے اردو، فارسی یا عربی وغیرہ میں داخلہ لے لو،ورنہ فیل ہوجاؤ گے۔لیکن ان لوگوں نے حوصلہ سے کام لیا اور اکنامکس کو ہی ترجیح دی اوراسی میں محنت سے پڑھائی کرتے رہے۔ جب امتحان ہوا تو غفران صاحب چوں کہ

شروع سے ہی ذہین اور محنتی تھے، حسب دستور ممتاز نمبر سے کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ان کے استاد نے انہیں بلایا اور آپ کی تعریف کی اور پھر کہا کہ میں واقعی حیران ہوں اور مجھے تعجب ہے کہ مدرسہ کے لڑکے بھی ایسے ہوتے ہیں۔ اسطرح سے پروفیسر غفران صاحب نے اپنی صلاحیت اور لیاقت سے لوگوں کے دلوں میں ایک مقام بنایا اور ساتھ ہی ساتھ مادر علمی جامعۃ الفلاح کا بھی نام روشن کیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۵ میں آپ کا انتخاب پری طب (بی یو ایم ایس) میں ہوگیا اور پھر وہیں سے آپ طب کے سفینہ پر سوار ہو گئے اور اسی کے ناخدا کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے دیتے کشتی کو بیچ سمندر میں ہی چھوڑ کر دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

بی یو ایم ایس کی تعلیم کے دوران حسبِ عادت پڑھنے لکھنے کا شوق برقرار رہا اور آپ درسی کتب کے علاوہ دوسری غیر درسی مضامین کا بھی اسی دلچسپی اور شوق سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو اپنے طب کے مضامین میں تو دسترس حاصل تھا، ساتھ ہی دوسرے مضامین میں بھی آپ عبوری صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ کسی بھی عنوان پر اگر آپ سے علمی بحث ہوتی تو آپ سامنے والے کو مطمئن کر دیتے تھے۔ خواہ وہ ادب سے متعلق ہو سیاسیات، معاشیات سے یا پھر جدید سائنس سے۔ آپ بیش تر علوم میں خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ آپ کی تحریری صلاحیت بھی کمال درجہ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے مضامین دوران طالب علمی بھی مختلف عالمی اور قومی جرائد اور میگزین میں شائع ہوتے تھے۔ یہاں پر بھی آپ اپنے حسن کردار اور بذلہ سنجی کی وجہ سے اپنے ہمعصر طلبہ ساتھیوں میں اور اساتذہ میں بے حد پسندیدہ تھے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ اپنی صحت کے لیے بھی کافی حسّاس تھے۔ چنانچہ آپ مختلف کھیلوں میں بھی مستعدی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ کرکٹ آپ کا پسندیدہ کھیل تھا۔ اس کے علاوہ آپ والی بال اور بیڈمنٹن بھی کھیلتے تھے۔ آپ نے ۱۹۹۲ میں بی یو ایم ایس کا کورس بھی بحسن وخوبی مکمل کرلیا۔ بی یو ایم ایس کے دوران آپ کے قریبی ساتھیوں میں ڈاکٹر مظفر الاسلام، ڈاکٹر شعیب احمد، پروفیسر بدرالدجیٰ خان، پروفیسر تنزیل احمد، پروفیسر تفسیر علی، پروفیسر جلیس احمد، ڈاکٹر حافظ صباح الدین، ڈاکٹر محمد عارف اصلاحی، ڈاکٹر ظفر الحق، ڈاکٹر مرغوب احمد انصاری، ڈاکٹر عابد انصاری اور ڈاکٹر حافظ ارشاد (سابق ایم۔ ایل۔ اے) قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ایم ڈی میں داخلہ کے لیے مسابقتی امتحان میں حصہ لیا اور پہلی ہی کوشش میں آپ نے کامیابی حاصل کر لی اور پھر آپ نے اپنی پسندیدہ شاخ یعنی شعبۂ علم الادویہ میں داخلہ لیا ایم ڈی کے دوران تعلیم آپ نے یونانی طب میں قابل قدر ریسرچ وتحقیق کا کام کیا اور آپ نے کئی مقوی اعضاء رئیسہ ادویہ جیسے جواہر مہرہ

وغیرہ کی اہمیت اور مختلف قلبی امراض میں ان کی افادیت پر ایک اہم تحقیقی کام کیا۔ ریسرچ و تحقیق پر مشتمل یہ تین سالہ کورس بھی الحمدللہ ۱۹۹۵ میں پایہ تکمیل کو پہونچا۔ اور آپ نے علم الادویہ میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ ایم ڈی کے دورانِ طالب علمی شعبۂ علم الادویہ میں آپ کے علاوہ دیگر ہم سبق رفقاء میں پروفیسر طارق احسن، پروفیسر جلیس احمد اور ڈاکٹر محمد تقی کا نام آتا ہے ان میں پروفیسر طارق احسن اس وقت ممبئی کے انجمن اسلام طبیہ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی و تحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں جبکہ پروفیسر جلیس احمد زیڈ وی ایم طبیہ کالج، پونہ میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں پروفیسر جلیس احمد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ حسن اتفاق سے وہ پروفیسر غفران صاحب کے ابتدائی تعلیم یعنی جامعۃ الفلاح سے ہی آپ کے ہم جماعت رہے ہیں۔ اس کے بعد بی یو ایم ایس اور پھر ایم ڈی کی تعلیم بھی دونوں نے ایک ساتھ تعلیم مکمل کی۔ اس طرح سے آپ دونوں پورے تعلیمی سفر کے ساتھی تھے۔ آپ کے اساتذہ میں حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب، حکیم سید ایوب علی قاسمی صاحب، پروفیسر محمد آصف صاحب، پروفیسر سعد الحسن آفاق صاحب، پروفیسر نعیم احمد خان صاحب اور پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب قابل ذکر ہیں جن سے آپ نے طب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی کے اصول اور تہذیبی اقدار و آداب بھی سیکھا۔

پروفیسر غفران احمد صاحب ابتدا سے ہی ایک سنجیدہ، ذہین اور محنتی طالب علم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کی صلاحیت اور یونانی طب کے میدان میں آپ کی قابلیت کو اس وقت ایک سند کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جب آپ کے تعلیم مکمل کرتے ہی جہاں آپ کے بہت سے ساتھی ذریعۂ معاش کی تلاش میں ملک و بیرون ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے، وہیں آپ کا تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد مادر علمی میں ہی پہلے عارضی طور پر پھر ۲۷ر جنوری ۱۹۹۷ء کو مستقل طور پر شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیتِ لکچرر کے تقرر عمل میں آیا۔ اس کے بعد تو آپ آگے ہی بڑھتے گئے، کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جس انتخابی کمیٹی میں آپ کا لکچرر کے عہدہ پر تقرر ہوا تھا، اس وقت ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب جیسا بارعب اور غیر جانب دار شخص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شیخ الجامعہ تھا اور پروفیسر حکیم نعیم احمد خان صاحب فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے ڈین اور شعبۂ علم الادویہ کے صدر تھے۔ سلیکشن کمیٹی میں پروفیسر غفران احمد صاحب کی لیاقت اور ان کے انٹرویو سے شیخ الجامعہ بہت متاثر ہوئے اس طرح سے آپ کی اپنی صلاحیت اور شیخ الجامعہ، ڈین و صدر شعبہ کے حسن انتخاب اور صحیح فیصلہ کی بدولت آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ جسے بعد میں آپ نے اپنی صلاحیتوں

سے ثابت بھی کردیا کہ آپ کا انتخاب آپ سے توقع اور امید کے عین مطابق بلکہ اس سے بھی بہتر ثابت ہوا۔ چوں کہ آپ نے دوران طالب علمی تمام مضامین کا انتہائی سنجیدگی اور پورے انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور آپ کی معلومات کافی وسیع تھی، چنانچہ اس کا عکس آپ کی تدریس پر نمایاں طور پر ظاہر ہوتا تھا۔ آپ بی یو ایم ایس کی سطح پر صیدلہ (یونانی فارمیسی) پڑھاتے تھے، جب کہ پوسٹ گریجویشن یعنی ایم ڈی میں آپ ریسرچ میتھوڈولوجی اور صیدلہ وتکلیس خصوصیت کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ خوش قسمتی سے ناچیز کو بھی یہ تمام مضامین آپ سے پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ سب سے پہلے ۲۰۰۱ء میں آپ سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ جب آپ کلاس میں داخل ہوتے تو واقعی پوری کلاس پر سکوت طاری ہوجاتا اور ہر طالب علم آپ کے لکچر کو پوری مستعدی اور خاموش ہوکر سنتا۔ آپ جب پڑھاتے تو دل کرتا کہ آپ کے لکچر کو حرف بہ حرف قلم بند کرلیا جائے۔ ہر مضمون کو آپ بہت ہی سلیس اور موثر انداز میں پڑھاتے تھے۔ یونانی نظریہ کے ساتھ ساتھ آپ سبجیکٹ کو جدید سائنسی معلومات سے ہم آہنگ کر کے اسے بہت وسیع اور دلچسپ بنادیتے تھے۔ جلد ہی آپ نے اپنے شاگردوں اور معاصرین میں ایک قابلقدر مقام بنالیا اور انکے درمیان یکساں محبوب اور پسندیدہ بن گئے تھے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (NIUM) میں بحیثیت پروفیسر تقرر

آپ شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے کہ اسی دوران ۲۶؍نومبر ۲۰۰۷ء میں ایک مرتبہ پھر آپ کی صلاحیت اور آپ کی محققانہ لیاقت کے اعتراف میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین (NIUM) بنگلور میں براہ راست لکچرر سے پروفیسر کے عہدہ پر آپ کا تقرر ہوگیا، چنانچہ آپ مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرائض سے رخصت لے کر بنگلور چلے گئے اور وہاں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات شروع کیں۔ بنگلور میں قیام کے دوران ہی مادر علمی علی گڑھ میں آپ کی سابقہ تدریسی وتحقیقی تجربات کی بنیاد پر ۲۷؍جنوری ۲۰۰۶ء سے ریڈر کے عہدے پر آپ کی ترقی ہوئی۔ بنگلور میں آپ کا قیام بہت مختصر رہا اور تقریباً دوسال وہاں گزارنے کے بعد کچھ گھریلو وجوہات اور پنشن کے تحفظ کی وجہ سے آپ نے ۲۹؍نومبر ۲۰۰۹ میں پروفیسر شپ سے مستعفی ہوکر دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لائے اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدہ پر شعبہ میں اپنی تدریسی اور تحقیقی خدمات کو آگے بڑھایا۔ مختصر سے قیام میں آپ نے بنگلور میں بہت سارے یادگاری کارنامے انجام دیے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز رہے، اس کے علاہ شعبہ کے سربراہ کا بھی اعزاز حاصل تھا اور دیگر بہت

ساری مقامی اور بیرونی کمیٹیوں کے ممبر کی حیثیت سے بھی آپ نے انسٹی ٹیوٹ کی خدمت کی۔غرض یہ کہ آپ نے اتنے کم وقفہ میں ادارہ اور وہاں کے طلبہ کے لیے بہت سارے مثبت کارہائے نمایاں انجام دیا۔اور کئی سارے یادگاری نقوش چھوڑآئے جو بعد والوں کے لیے ایک مثال اور مشعل راہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ جب آپ نے وہاں سے آنے کا قصد کیا تو وہاں کے طلبہ اور آپ کے معاصرین کے درمیان ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی اوران لوگوں نے آپ کو بہت روکنا چاہا اور طرح طرح کے واسطے دیے کہ آپ کے اس مختصر دورانیہ میں انسٹی ٹیوٹ نے کافی ترقی کی اور مختلف جہات میں بے شمار کام ہوا ہے۔اگر آپ مزید اپنی خدمات یہاں دیں گے تو بلاشبہ یہ ادارہ ایک نمایاں اوراعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔مگر دو وجوہات کی بناپر مجبوراً آپ نے بنگلور چھوڑنے کا ارادہ کیا۔حالاں کہ آپ بارہا کہا کرتے تھے کہ بنگلور میں کام کرنے اور ریسرچ وتحقیق کے بہت مواقع ہیں اور وہاں کا ماحول اور موسم بھی کافی موزوں اور سازگار ہے لیکن میں نے صرف دو وجہوں سے بنگلور چھوڑا: ایک فیملی کی وجہ سے، کیوں کہ بچے چھوٹے تھے اور وہ لوگ علی گڑھ میں ہی مقیم تھے اور دوسری وجہ پنشن سے جڑی تھی، بنگلور میں آپ کا تقرر نئی پنشن (NPS) کے حساب سے ہوا تھا۔جب کہ علی گڑھ میں آپ پرانی پنشن کے زمرے میں آتے تھے۔اگر آپ کی علی گڑھ کی پنشن بنگلور ٹرانسفر ہوجاتی، جس کے لیے آپ کوشاں بھی تھے،تو شاید آپ پھر وہیں پر اپنی خدمات جاری رکھتے اور انسٹی ٹیوٹ کو ایک نئی بلندی کی طرف لے جاتے۔بہرحال انسان کے اندر اگر صلاحیت ہو اور اسے کچھ کرنے کا حوصلہ اور جذبہ ہو تو اس کے لئے پھر زماں ومکاں کی قیود وبند معنی نہیں رکھتی ہیں۔

علی گڑھ واپسی

آپ نے بنگلور سے واپس آنے کے بعد علی گڑھ میں اپنی تدریسی وتحقیقی کاوشوں کو مزید رفتار دی اور آپ کے پاس حکومت ہند کے کئی پروجیکٹ حاصل تھے۔جس میں یونانی ادویہ کی معیار بندی اور اسکو مؤثر بنانے نیز دواؤں کی افادیت کو مختلف امراض میں ثابت کرنے کے لیے ان دواؤں کو جدید سائنسی معیار پر مطالعہ کرنا تھا۔چنانچہ آپ نے اس میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی اور آپ نے حکومت کے زیر انتظام منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔جنوری ۲۰۱۲ء میں آپ کا اپنی ترقی کے آخری منزل یعنی پرفیسر شپ کے عہدہ پر تقرر ہوا۔آپ نے اپنے ۲۴؍سالہ تدریسی وتحقیقی تجربات میں لاتعداد اور اپنی نوعیت کے نت نئے کام انجام دیا۔اس کے علاوہ آپ کے زیر نگرانی بہت سارے طلبہ نے اپنے تحقیقی کام انجام دیے۔تقریباً ۳۸؍ طلبہ نے آپ کے زیرِ نگرانی طب کے مختلف موضوعات پر ریسرچ وتحقیق کا کام انجام دیا۔آپ کی کئی اہم

کتابیں اور مختلف کتابی ابواب عالمی معیار کے پبلشر کے ذریعہ شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ ۱۰۰؍ سے زائد آپ کے ریسرچ پیپر اور مقالے مختلف عالمی اور قومی اعلیٰ معیاری جرائد اور میگزین میں شائع ہوئے ہیں۔ بے شمار دعالمی اور ملکی کانفرنسز اور سمینارز میں آپ نے شعبہ اور یونیورسٹی کی نمائندگی کی ہے۔سیکڑوں کانفرنسز اور علمی نشستوں میں آپ نے سائنٹفک اجلاس کی صدارت کی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) سے حاصل شدہ ایک اہم پروجیکٹ ڈی آر ایس۔۲(DRS-II) کے کوارڈینیٹر کا شرف بھی آپ کو حاصل تھا، جو کہ شاید ہی کسی یونانی طب کے ادارہ کو نصیب ہو۔ یہ اسکیم پوری یونیورسٹی میں صرف دو یا تین شعبہ جات کو حاصل ہے۔اس کے ساتھ ہی آپ متعدد اہم کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے مثلاً:

- وزارت آیوش، حکومت ہند کے ماتحت فارما کو پیا کمیٹی کے ممبر
- جامعہ ملیہ اسلامیہ میں یونانی میڈیسین کی ابتداء کئے جانے سے متعلق کمیٹی کے ممبر
- جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز کے ممبر
- NIUM بنگلور، میں ادارہ جاتی اخلاقیات کمیٹی کے ممبر
- NIUM بنگلور، میں جانوروں کے اخلاقیات کمیٹی کے صدر
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جانوروں کی اخلاقیات کمیٹی کے ممبر
- انڈین فارماکولوجیکل سوسائٹی کے ممبر
- سی ایس آئی آر۔ ٹی کے ڈی ایل۔نئی دہلی، ٹاسک فورس ممبر
- فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ریسرچ کوآرڈینیشن کمیٹی کے ممبر
- وزارت آیوش، حکومت ہند کے ذریعہ آیورویدا اور یونانی کو بین الاقوامی درجہ بند بیماریوں میں شامل کیے جانے سے متعلق کمیٹی (کمیٹی برائے روایتی طب) کے ممبر
- عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے ذریعہ تشکیل دی گئی ایک ڈرافٹ کمیٹی جو کہ بنیادی طور پر یونانی طب کی اصطلاحات مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس میں ایک Expert Member کی حیثیت سے آپ کا نام شامل ہے۔غرض یہ کہ یونانی طب سے متعلق بیش تر اہم کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

متعدد اہم قومی و بین الاقوامی جرائد اور میگزین کے ایڈیٹر، ایسوسی ایٹ ایڈیٹر اور ممبر مجلس ادارت کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات حاصل تھیں۔اسی طرح بہت سارے عالمی اور قومی معیار کے جرائد اور رسالہ

جات کے ریویور کی حیثیت سے بھی آپ کا نام سرِ فہرست ہے۔ آپ فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کی جانب سے شائع ہونے والے عالمی جرنل یونانی میڈیکس کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر بھی تھے، جسے اچھے اور معیاری مضامین کے ساتھ پابندی سے شائع کرنا ایک اہم فریضہ تھا، جس کو آپ نے دیگر معاونین کے ساتھ مل کر خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھا ۲۰۱۵ میں جب پروفیسر حکیم نعیم احمد خان صاحب دوبارہ فیکلٹی کے ڈین کے عہدہ پر فائز ہوئے تو پروفیسر غفران احمد صاحب نے استاد محترم کو ایک بہت ہی قیمتی اور موزوں مشورہ دیا کہ سراب تک فیکلٹی کے تمام شعبہ جات میں جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، انھیں یکجا کر کے اگر ایک کتابی شکل دے دی جائے تو میرے خیال سے یہ مستقبل کے لیے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ ڈین صاحب نے آپ کی تجویز کو سراہا اور اس کام کو آپ کے حوالہ کر دیا۔ چنانچہ آپ کی انتھک کاوشوں کی بدولت آج ہم لوگوں کے سامنے اب تک کے تمام مطالعات وتحقیقات یونانی میڈیکس ۲۰۱۵، جلد دوم (اسپیشل کمپنڈیم) کی شکل میں ایک نایاب تحفہ کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔

بیرون ملک طب کی خدمت

آپ کی یونانی طب میں جو گرفت اور عمیق معلومات تھی، اس کو صرف ملکی سطح پر ہی نہیں سراہا گیا بلکہ طب کے میدان میں آپ کی صلاحیت اور تبحر علمی کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ چنانچہ دوسرے ملکوں نے بھی آپ سے یونانی اور روایتی طب کی اہم اور بیشتر مفید معلومات سے استفادہ کیا۔ اس طرح سے عالمی سطح پر بھی آپ نے یونانی طب کی بہترین نمائندگی کی اور طب یونانی کو عالمی پیمانہ پر روشناس کرایا۔ جن ملکوں کا آپ نے دورہ کیا یا وہاں یونانی طب سے متعلق اپنی خدمات بہم پہونچائیں ان میں سے کچھ اہم درج ذیل ہیں۔

سری لنکا (کولمبو) کا سفر

سری لنکا کی دارالحکومت کولمبو میں ۲۶ سے ۲۹/ اکتوبر ۲۰۱۷ء میں آیوروید، یونانی، سدھا اور دیگر روایتی طب کی ترویج وترقی اور عالمی سطح پر روایتی طبوں کی اہمیت اور مقبولیت سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں پروفیسر غفران احمد صاحب نے طب یونانی اور دیگر روایتی طبوں کی اہمیت اور ان کے محفوظ اور کارگر طریقۂ علاج پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ چنانچہ آپ نے یونانی طب کو عالمی پلیٹ فارم پر دوسرے لوگوں کو بھی اس کی اہمیت کا احساس کرایا۔ یہی عالمی احساس اب دوسرے علاقوں اور خطوں میں بھی روایتی طبوں کے پھیلاؤ کا محرک بن رہا ہے اور یہ جدید دنیا میں ایک بازیافت کی صورت میں

متعارف ہو رہی ہیں۔ عالمی سطح پر جنم لینے والی یہی فکر یونانی طب کی توسیع کا بھی سبب بن رہی ہے۔

ماریشش کا دورہ

پروفیسر غفران احمد صاحب نے یونانی طب کو متعارف کرنے کے لیے ۱۰ رتا ۱۷ رفروری ۲۰۱۹ء ماریشس کا ہفت روزہ دورہ کیا تھا۔ اس کا اہتمام امریکی ادارہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (IIIT,USA) کے تعاون سے مشترکہ طور پر ماریشس کی دو معروف سماجی تنظیموں ہیومن ویلفیر لیگ (HWL) اور اسلامک میڈیکل اینڈ الائڈ ہیلتھ پروفیشنل ایسوایشن (IMAHPA) نے کیا تھا۔ ماریشس میں آپ کو مدعو کرنے کا منشا تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کو یونانی طب سے متعارف کرنے کے علاوہ وہاں اِس کے فروغ کے امکانات کا جائزہ لیں اور اسے عملی شکل میں لانے کے لیے جامع لائحۂ عمل پیش کریں۔ چنانچہ سماج کے ہر طبقے سے ارتباط اوران سے تبادلۂ خیال کے لیے ایک وسیع پروگرام کا نظم کیا گیا تھا۔ آپ نے ماریشس کے عوام وخواص، حکومت کے اہلکاروں، میڈیکل پروفیشنلز، اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و اساتذہ سے مل کر یونانی طریقۂ علاج کی واقفیت بہم پہنچائی اور ضروری معلومات فراہم کیں۔ اپنے دورے کے دوران انھوں نے ۷ رلکچرس دیے، ۳ راؤنڈ ٹیبل ٹاک میں حصہ لیا اور ۴ راسکولوں میں خطاب کے علاوہ میڈیا سے روبرو ہوئے اور مختلف اخبارات کو انٹرویو دیے۔

پروفیسر غفران صاحب کے دورہ سے ماریشس اور وطن عزیز کے درمیان رشتوں کو مزید تقویت ملی ہے اور اُن کے دورہ کے نتائج بے حد حوصلہ افزا رہے ہیں۔ ہند ماریشس کے درمیان مفاہمتی قرارداد کے تحت جلد ہی وہاں سرکاری سطح پر ایک آیوش اسپتال شروع ہونے کی امید ہے۔ استاد محترم کے دورہ کا یہ پہلو بڑا ہی نتیجہ خیز رہا کہ اب اس اسپتال میں یونانی طب کی خاطر خواہ حصہ داری کی توقع ہے، ورنہ بعض سیاسی تعصّبات کی وجہ سے اس کے جائز حصص میں خرد برد کا اندیشہ تھا۔ آپ نے ماریشس میں یونانی طب کے تعارف اور ترجمانی کا بھرپور فریضہ انجام دیا۔ اُن کے ذریعہ ماریشس کے لوگوں کے لیے یہ جان کاری ایک خوش گوار حیرت جیسی تھی کہ یونانی طب سائنسی اور عقلی بنیاد کا حامل معالجاتی سسٹم ہے۔ اس لیے کہ اب تک وہ محض اسے روایتی انداز کا ایک طریقۂ علاج سمجھتے تھے۔ یونانی طب سے صحیح واقفیت کے بعد ماریشس کے دوسرے میڈیکل پروفیشنلز نے بھی اس کے تئیں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ رفاہی طور پر کام کرنے والے کئی سماجی اداروں نے بھی اپنے وسائل سے یونانی مطب و معالجہ کے قیام کے سلسلے میں عزائم کی یقین دہانی کرائی ہے۔ نوجوان طلبہ میں بھی

یونانی طب کے تئیں دھیرے دھیرے دل چسپی پیدا ہونے لگی ہے اور وہ طبی تعلیم کی طرف مائل ہوتے نظر آرہے ہیں۔ آپ کے انتہائی کامیاب دورے کی وجہ سے یہ خبر بڑی خوش آئند ہے کہ اب یونانی اور دوسری روایتی طبوں کو عالمی توجہ حاصل ہورہی ہے۔ چنانچہ انہیں محفوظ اور کارگر طریقۂ علاج کی صورت میں دیکھا جانے لگا ہے، جونظریاتی سطح پر ایک قسم کے بدلاؤ کا عندیہ ہے۔ ماریشس کی یونانی طب سے دلچسپی، اس طریقۂ علاج کی طرف بڑھتے عالمی رجحان کا ایک مظہر ہے۔ اس طرح استاد محترم کے دورہ کی یہ بڑی حصولیابی سمجھی جارہی ہے کہ اس سے ماریشس میں یونانی طب کے لیے امکانات کے نئے دروازے کھلے ہیں اور یہ ملک یونانی طب کی ایک نئی زمین کی صورت میں ابھر رہا ہے۔ حسبِ توقع اگر اس دورہ کے نتائج برآمد ہوتے ہیں تو ماریشس میں یونانی طب کے حوالہ سے آپ کی کوششوں کو یاد رکھا جائے گا۔

البلاغ اکیڈمی، لندن (آن لائن) لکچر سیریز

ابھی حال ہی میں البلاغ اکیڈمی لندن کے ذریعہ یونانی میڈیسن کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کے لیے ایک آن لائن سرٹیفکٹ کورس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس میں آپ نے یونانی طب پر ایک لکچر سیریز دیا۔ اس اکیڈمی کا مقصد ہی ہے کہ عالمی پیمانہ پر یونانی دانشوروں اور ماہرین کے ذریعہ یونانی طب کی اہمیت اور اس کی بنیادی تعلیمات سے دوسرے طب کے مجتہدین کو روشناس کرانا تاکہ وہ یونانی اور دیگر روایتی طبوں اور انکے طریقۂ کار کو سمجھ سکیں۔ پروفیسر غفران صاحب نے اس سیریز میں یونانی طب کے بنیادی اصول، طب کے کلیاتی مباحث، فلاسفی اصول نیز بہت ساری بیش قیمتی اور اہم معلومات سے طلبہ کے علم میں اضافہ کیا۔ پروفیسر غفران صاحب کے لکچر اور آپ کے طریقۂ تدریس سے طلباء حد درجہ متأثر تھے۔ چنانچہ ان کے اندر طب یونانی سے متعلق ایک خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور طب کے مزید بنیادی ماخذ اور اس کے رموز ونکات کو جاننے کی ان کے اندر ایک جستجو پائی گئی، جس کا اندازہ ان کے تعزیتی پیغامات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے یونانی طب کی ترویج وترقی میں پروفیسر غفران صاحب کی ان کاوشوں کو سنہری حروف سے لکھا جائے گا اور اس عظیم کارنامہ کو گراں باب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

عادات واطوار

پروفیسر غفران احمد مختلف الجہت اور آفاقی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت مرجع تقلید طب، ماہر کلام، عظیم عارف اور بلند پایہ محقق تھے اور ساتھ ہی بااخلاق اور تہذیب وتمدن کے عظیم پیکر تھے۔ ان

کی ذات صبر، حلم، انکسار، علم، اخلاق، تواضع اور مجاہدت سے آراستہ تھی۔ اتنی خصوصیات بیک وقت کسی انسان میں جلدی یکجا نہیں ہوتی ہیں، لیکن استاد محترم کی ذات بلا مبالغہ مختلف اور متضاد صفات کی حامل تھی۔ چنانچہ اہلیہ کے لیے ایک مثالی خاوند، بچوں کے لیے ایک مشفق اور ہمہ وقت متفکر باپ، اور بھائیوں اور بہنوں کے لیے ہمیشہ ایک فکرمند بھائی کی طرح تھے آپ کی شرافت اور بھائیوں کا احترام اس قدر تھا کہ آپ کے برادران کہتے ہیں کہ غفران نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی ناگواری کا ردعمل ظاہر نہیں کیا اور ہمیشہ ہم لوگوں کے سامنے اس کا سر جھکا ہی رہتا تھا۔ آپ اپنے اساتذہ، اپنے معاصرین واحباب، شاگردوں، شعبہ کے تمام اراکین حتیٰ کہ عام لوگوں میں بھی جو ایک مرتبہ بھی آپ سے ملا آپ کا گرویدہ ہوگیا۔ اس طرح سے آپ بلا کسی تخصیص کے تمام لوگوں کے درمیان یکساں مقبول اور محبوب تھے۔ آپ کے حسن اخلاق اور منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ ہر کوئی جو آپ سے شناسا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ میں ہی استاد محترم کے سب سے قریب ہوں۔ آپ ہر ایک سے بہت ہی پرتپاک اور خوش مزاجی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اساتذہ کی عزت اور احترام کوئی آپ سے سیکھے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے جب بھی آپ کا کوئی استاد آپ کے پاس آتا تو آپ فوراً ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے استاد محترم کو اپنی کرسی پیش کر دیتے۔ اگر اتفاق سے آپ کے استاد آپ کی پیش کش قبول نہیں کرتے تو کیا مجال آپ اپنی مختص نشست پر دوبارہ بیٹھ جاتے آپ بھی اپنے استاد محترم کے پاس ایک طرف احترام کے ساتھ بیٹھ جاتے اور پھر جب استاد وشاگرد میں ہم کلامی ہوتی تو آپ استاد کے احترام میں مستقل اپنے سر کو نیچے رکھتے، جواب بھی دینا ہوتا تو بھی آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کرتے۔ نیز کسی کام کو کرنے سے پہلے اپنے اساتذہ سے ضرور مشورہ کیا کرتے تھے۔ آپ کے کردار کی بلندی میں ظاہر ہے آپ کے اساتذہ کی دعائیں شامل حال تھیں۔

آپ کا رویہ اپنے شاگردوں سے بے تکلفانہ اور دوستانہ تھا۔ آپ کے طریقۂ تدریس وتحقیق نے آپ کے شاگردوں کو کافی متاثر کیا۔ استاد ہوگئے تھے، مگر کبھی شاگردوں کے سامنے اپنے آپ کو استاد کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی کہا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ہمیشہ اپنے شاگردوں اور رفقاء سے گھرے رہتے تھے، جب بھی ہم لوگ آپ سے ملنے جاتے تو کوئی نا کوئی آپ کے پاس آپ سے محو گفتگو ہوتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ جب بھی اپنے شاگردوں یا اپنے دوستوں سے ہم کلام ہوتے تو انہیں پورا وقت دیتے۔ نیز سامنے والے کی بات پوری سنجیدگی سے سنتے اور پھر متعلقہ موضوع پر تسلی بخش جواب دیتے۔ کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ آپ کو کوئی چیز گراں لگ رہی ہو۔ فیاضی

اور سخاوت بھی ان کی عادت میں شامل تھی۔ آپ کے کچھ ساتھی جو معاشی اعتبار سے کمزور تھے، ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ علماء اور اہل مدارس سے بھی خاص انسیت تھی۔ خصوصاً اپنے مادر علمی جامعۃ الفلاح کی بہتری اور اس کی مالی اعانت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے جامعۃ الفلاح سے مولانا اظہار صاحب اور مولانا امیر فیصل صاحب علی گڑھ تشریف لائے تھے، ان لوگوں کی پروفیسر غفران صاحب سے کسی مصروفیت کی بنا پر ملاقات نہیں ہوسکی تھی اور اتفاق سے اسی روز ان حضرات کی کیفیات سے واپسی بھی تھی اور آپ کی بھی مصروفیت زیادہ تھی اور شام میں آپ کو ایک قریبی عزیز کی شادی میں شریک ہونا تھا۔ چنانچہ آپ شادی سے جلدی فارغ ہو کر سیدھے اسٹیشن پہونچ گئے تاکہ ان لوگوں سے ملاقات ہو جائے، لیکن کافی کوشش کے باوجود ان لوگوں سے ملاقات ممکن نہیں ہوسکی۔ اگلے روز آپ نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا اور کافی رنجیدہ خاطر تھے۔ بہر حال آپ نے مجھ سے کہا یہ رقم لو اور اپنے نیٹ بینکنگ کے ذریعہ فلاح کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دو۔ اسی طرح شعبہ اور کالج کے تمام تدریسی و غیر تدریسی عملہ میں آپ کی ایک خاص پہچان تھی۔ ہر کوئی آپ سے کسی بھی مسئلہ کی تفتیش یا مفید مشورہ کے لیے آپ کے پاس بلا تکلف حاضر ہوتا اور آپ بھی حسب توقع ان کو ہر چیز سے اوپر اٹھ کر بہترین مشورہ دیتے اور سامنے والے کو مطمئن کر دیتے۔ شعبہ کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے اور یہاں پر کام کرنے والوں کی برابر خبر گیری کرنا اور ان کی ترقی اور بھلائی کے لیے ہر ممکن کوشش ان کی عادت حسنہ تھی۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

اہم مناصب

پروفیسر غفران احمد صاحب کی شخصیت بالکل منفرد قسم کی تھی۔ عام طور پر یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان عہدہ اور منصب کے لیے خواہش مند رہتا ہے اور اس کے لیے کوشاں بھی رہتا ہے۔ لیکن یہاں پر بھی استاد محترم اپنی مثال آپ ہیں، آپ کو متعدد بار مختلف عہدوں اور اہم مناصب کی پیش کش کی گئی، مگر آپ نے بہت ہی انکساری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کبھی عہدہ اور منصب کی خواہش تو دور اگر آپ کو کوئی عہدہ بطور ضابطے اور قانون کے بھی ملتا یا اس کا پتہ چلتا تو استاد محترم کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو جاتی تھی اور آپ اس سے حتیٰ الامکان بچنے کی کوشش کرتے۔ مثال کے طور پر پہلی مرتبہ جب آپ کا نمبر شعبہ کے صدر کے لیے آیا تو آپ نے شعبہ کے عہدۂ صدارات قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ لیکن دوبارہ مجبوراً آپ کو قبول کرنا پڑا۔

اسی طرح جب آپ NIUM بنگلور سے واپس علی گڑھ آ گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کے انتظامی اموراور صلاحیتوں کے اعتراف میں حکومت کی طرف سے آپ کے پاس انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شپ کے لیے براہ راست تقررنامہ آیا۔لیکن استاد محترم نے بہت ہی خاموشی سے اس خط کا جواب منفی میں لکھ کر مرسل کے پاس دوبارہ بھیج دیا اور کسی کو کانوں خبر بھی نہیں لگی۔منع کرنے کے بعد پھر دیگر لوگوں کو اس سلسلہ میں بتایا۔ایسے ہی ایک دفعہ آیوش ایکسپرٹ کی حیثیت سے آپ کو WHO کے ہیڈ کوارٹر جینیوا میں طب کی خدمت کا سنہرا موقع حاصل تھا، جہاں تمام مراعات پورے حکومتی اعزاز کے ساتھ حاصل تھیں۔مگر اسے بھی استاد نے بہت خوبی کے ساتھ منع کر دیا۔اسی طرح بیرون ممالک جیسے جنوبی افریقہ، بنگلہ دیش وغیرہ ملکوں میں یونانی طب کی اشاعت وترقی کے لیے یونانی چیئر کی حیثیت سے آپ کو آفر تھا،مگر یہاں بھی استاد محترم نے کسی لالچ میں آئے بغیر منع کردیا۔اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ آپ ذمہ داریوں سے راہ فرار چاہتے تھے۔بلکہ آپ کے اندر وہ تمام صلاحیتیں اور مہارت وحذاقت بدرجۂ اتم موجود تھیں، جو انتظامی امور کے لیے لازم ہوتی ہیں۔وجہ بس احساس ذمہ داری اور پوری دیانت داری سے اس کی انجام دہی کا تھا۔اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں جو آپ کی شخصیت سے جڑی ہوئی ہیں۔بہرحال ان سب کے باوجود آپ درج ذیل اہم اموراور مناصب پر فائز رہے۔

- موجودہ صدر، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- کوارڈینیٹر ڈی آر ایس۔۲، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔نئی دہلی
- سابق صدر، شعبۂ علم الادویہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ تا ۲۰۰۹)
- ڈپٹی ڈائریکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۸ تا ۲۰۰۹)
- انچارج اکیڈمکس نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ تا ۲۰۰۹)
- سابق صدر، ادارہ جاتی اخلاقیات کمیٹی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور (۲۰۰۷ تا ۲۰۰۹)
- نوڈل آفیسر برائے نیک (NAAC) فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- جوائنٹ ڈائریکٹر، مرکز برائے ترقی ٔ سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (جولائی، ۲۰۱۹)
- صدر، انوویشن اینڈ پیٹینٹ سیل، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲۰۲۱)
- صدر، انکیوبیشن سینٹر، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲۰۲۱)

اعزازات

آپ کی صلاحیت اور یونانی طب میں آپکی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں آپ کو بہت سارے مؤقر اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ان میں سے کچھ اہم اعزازات درج ذیل ہیں۔

☆حکیم احمد اشرف میموریل قومی ایوارڈ۔۲۰۰۹

☆آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (ایمس) کے عالمی کانفرنس میں آپ کو انسٹی ٹیوشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔۲۰۱۴

☆جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں آپ کو بہترین یونانی اسکالر ایوارڈ دیا گیا۔۲۰۱۶

☆وزارتِ آیوش ،حکومت ہند دہلی کے ذریعہ یونانی طب میں ڈرگ ریسرچ زمرہ میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ دیا گیا۔۲۰۱۷

☆وزارتِ آیوش ،حکومت ہند دہلی کے ذریعہ یونانی ادویہ میں ریسرچ اور تحقیق کے لئے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (بیسٹ ریسرچر) سے بھی نوازا جا چکا ہے ۲۰۱۸

تعزیتی پیغامات

ملک و بیرونِ ملک سے متعدد شخصیات نے آپ کے سانحۂ ارتحال پر اپنے دل خراش اور پُرغم تعزیتی پیغامات استاد محترم کے متعلقین اور اعزاء و اقارب کے لیے ارسال کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

’’پروفیسر غفران کو ان کی نفیس شخصیت ،سخت نظم وضبط ،طلباء کی نگرانی اور سب سے بڑھ کر ایک پُر جوش استاد کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ان کے انتقال سے یونیورسٹی برادری ایک ممتاز استاد سے محروم ہوگئی ہے جن کا یونانی طب کی تدریس کے میدان میں خاص حصہ تھا۔پروفیسر غفران کا انتقال میرا ذاتی نقصان ہے۔‘‘ (**پروفیسر طارق منصور**،شیخ الجامعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

’’پروفیسر غفران کا اچانک انتقال بہت ہی تکلیف دہ ہے، یہ ایسا غم ہے کہ آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ پروفیسر غفران چونکہ میرے شاگرد تھے لہٰذا ان سے میرا ذاتی لگاؤ تھا میں بہت قریب سے انھیں جانتا تھا وہ ایک انتہائی پڑھے لکھے اور قابل شخص تھے ان کے چلے جانے سے یونانی طب میں اور خصوصاً شعبہ میں ایک نا تلافی خلا پیدا ہوگئی ہے۔ان کی ابھی سسٹم کو ضرورت تھی۔ان کے انتقال سے پوری طبی برادری ایک ممتاز محقق اور استاد سے محروم ہوگئی ہے اللہ سے دعا ہے کہ انکی مغفرت فرمائے، جنت میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور احباب

ومتعلقین کو اس دکھ بھری گھڑی میں صبر دے اور ان کا نعم البدل عطا کرے۔'' آمین (**پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن** اعزازی خازن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''پروفیسر غفران صاحب کا انتقال ایک عظیم سانحہ ہے جس کا ملال ایک عرصہ تک رہے گا۔ ہمارے مابین ایک دیرینہ اور بہترین رفاقت تھی لہٰذا میں اپنے غم کو لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ وہ طب یونانی کے عظیم دانشور اور مفکر تھے۔ چنانچہ آپ طب کے معلم کے علاوہ ایک مایہ ناز محقق تھے۔ آپ کا نیشنل انسٹی ٹیوٹ، بنگلور سے گہرا رشتہ تھا۔ آپ کی رحلت سے طب یونانی کا بہت بڑا اور غیر تلافی نقصان ہوا ہے۔ میری اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔'' آمین (**پروفیسر عبدالودود**، ڈائریکٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (NIUM) بنگلور، کرناٹک)

''جواں سال مرد پروفیسر غفران صاحب کے انتقال کی خبر نے بہت ہی صدمہ اور غم میں مبتلا کردیا ہے آپ بہت ہی سنجیدہ اور بردبار شخصیت کے حامل تھے۔ آپ ایک تجربہ کار اور پسندیدہ استاد تھے اور طلباء میں بیحد مقبول تھے آپ بہت محنتی تھے اور چیزوں کو بہت قریب سے سمجھتے تھے پروفیسر غفران صاحب کے انتقال سے فیکلٹی کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس غم میں ہم برابر کے شریک ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر دے۔'' آمین (**پروفیسر فواد سعید شیرانی**، ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''پروفیسر غفران صاحب کے اچانک انتقال سے پوری اجمل خان طبیہ کالج برادری عموماً اور شعبۂ علم الادویہ خصوصاً بہت ہی صدمہ اور غم میں ہے وہ ایک اچھے استاد اور عمدہ محقق تھے۔ پروفیسر غفران صاحب کے جلدی انتقال سے ایک خلا پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ انکے متعلقین اور اہل وعیال کو صبر دے اور ان کو اس غم کو برداشت کرنے کی قوت دے نیز انکی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔'' آمین (**ڈاکٹر سعود علی خان**، پرنسپل، اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''میرا لائق شاگرد نہیں رہا۔ پروفیسر غفران کے انتقال کی خبر سے مجھے بہت ہی صدمہ اور تکلیف پہونچی ہے۔ میرا ان سے تقریباً تین دہائیوں کا ایک دیرینہ اور قریبی تعلق تھا پہلے ہمارا رشتہ استاد اور شاگرد کا تھا اور بعد میں شعبہ کے رفیق کی حیثیت سے ہوا اسکے بعد تو پھر گھر کے ایک فرد کے مانند ہوگئے تھے لہٰذا مجھے جتنی تکلیف ہے میں بیان نہیں کرسکتا۔ پروفیسر غفران کا انتقال میرا ذاتی نقصان ہے۔ پروفیسر غفران ایک اچھے استاد تو تھے

ہی اس سے بڑھ کر محقق بہت اچھے تھے ہمیشہ کچھ نیا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے ان سب سے اوپر اٹھ کر انسان بہت اچھے تھے۔ بہر حال اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ انکی مغفرت فرمائے، جنت میں بہترین مقام عطا کرے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔'' آمین (**پروفیسر حکیم نعیم احمد خان**، سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، سابق صدر شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''پروفیسر غفران صاحب کا انتقال ہم سب کے لئے بہت ہی اندوہناک اور تکلیف دہ ہے۔ وہ بے حد شریف، بہت تعلیم یافتہ، منکسر المزاج، متمدن اور مہذب شخص تھے یہ سانحہ فیکلٹی اور طبی برادری کے لئے غیر تلافی نقصان کا باعث ہے۔ اللہ انکی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔'' آمین (**پروفیسر تاج الدین**، سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، سابق صدر شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''انا للہ وانا الیہ راجعون بہت دکھ بھری خبر ہے استاد مکرم کے سانحۂ ارتحال سے طب یونانی کا ایک درخشندہ باب بند ہوگیا پروفیسر غفران صاحب کا انتقال ہم سب کے لئے بہت ہی افسوسناک اور باعث تکلیف ہے۔ شعبہ کا بہت بڑا نقصان ہے۔ اس غم میں ہم برابر کے شریک ہیں خداوند کریم انکی مغفرت فرمائے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لوحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔'' آمین (**ڈاکٹر عبدالرؤف**، صدر شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

''الفاظ ہی نہیں ہیں۔ پروفیسر غفران صاحب حد درجہ شریف اور میرے ایک لمبے عرصہ کے ساتھی تھے۔ غیر تلافی نقصان ہے۔ اللہ انکی مغفرت فرمائے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اللہ ہم سب پر اپنا رحم کرے۔'' آمین (**پروفیسر اشہر قدیر**، صدر شعبۂ کلیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

البلاغ اکیڈمی (لندن) کے بہت سارے رفقاء کی جانب سے تعزیتی پیغامات

''خوش قسمتی سے ہم لوگوں کو مرحوم پروفیسر غفران احمد صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع نصیب ہوا لہٰذا اس سانحہ سے ہمیں کافی صدمہ اور افسوس ہے اس غم کی گھڑی میں ہم ان کے قریبی اعزاء و اقارب کے لیے اپنے تعزیتی پیغامات ارسال کر رہے ہیں۔ یہاں ان کے حق میں تمام طلباء کے ذریعہ بھیجے گئے، تعزیتی پیغامات اور دعائیں اجتماعی طور پر ارسال کر رہے ہیں۔ اللہ ان کی کمیوں کو معاف کرے ان پر رحم کرے۔ جنت الفردوس میں صالحین کے درمیان مقام عطا فرمائے۔ یہ واقعی بہت ہی اعزاز کی بات ہے کہ اتنے

سارے لوگ دنیا کے مختلف کونوں سے آپ کو اپنی دعاؤں میں یاد کر رہے ہیں۔'' (**ادیبہ ریاض**، ایڈمن ٹیم، البلاغ اکیڈمی، لندن)

''اللہ سبحانہ تعالیٰ پروفیسر کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور انکی پوری فیملی پر اپنا خاص رحم فرمائے اور اس مشکل وقت میں آسانی پیدا کرے۔'' (**زاہدہ محمد**، جوہانس برگ، جنوبی افریقہ)

''السلام علیکم! ہمارے محبوب پروفیسر کے پیارے اہل خانہ۔ میں بہت ہی بوجھل دل اور نم آنکھوں سے اپنے محترم استاد اور مینٹر کے لئے یہ پیغام لکھ رہی ہوں۔ بطور ایک ہندوستانی میں خود حالات کو اپنی آنکھوں سے یہاں دیکھ رہی ہوں میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بس اس بات پر صبر اور امید ہے کہ بہتر ٹھکانے کی طرف کوچ کیا ہے اللہ سے بہتر ملاقات کے لئے اور ایسی زندگی کے لئے جہاں نہ غم ہوگا نہ کوئی حزن ان شاء اللہ۔ پروفیسر غفران ایک مثالی شخص اور ایک اچھے منٹر تھے وہ ہمیشہ ہماری دعاؤں میں رہیں گے انشاء اللہ۔ اللہ انکی مغفرت فرمائے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور انکے خاندان کے افراد کو صبر دے اور انھیں ان کی وراثت کو سنبھالنے کی پوری طاقت دے۔ پیار اور دعاء (**امّ محمد، عائشہ** جیگانی، ممبئی، انڈیا)

اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ان کے درجہ کو بلند کرے اور انکی قبر کو جنت کے باغات میں سے ایک باغ بنائے۔ آمین (**سمیہ پٹیل**، مانچیسٹر، یو۔کے)

''پروفیسر غفران نے مجھے اور میرے بیٹے کو ایک بہت ہی مختصر وقت کے لئے پڑھایا تھا مگر ان کے علم اور جذبہ نے ماشاء اللہ بہت متأثر کیا۔ اللہ تعالیٰ پروفیسر غفران پر اپنے رحم کا معاملہ فرمائے، ان کے گناہوں کو معاف کرے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور انکے اہل خانہ اور تمام لواحقین کو طاقت اور صبر جمیل دے۔ مجھے پورا یقین ہے وہ ہمیشہ یاد آئیں گے۔ دلی ہمدردی کے ساتھ مسز راوت۔ (**مسز ایچ۔راوت**، کوونٹری، یو۔کے)

''السلام علیکم! آپ پر اللہ کی رحمت نازل ہو۔ میں پروفیسر غفران احمد کے انتقال کی اندوہناک خبر سن کر بہت حیران ہوں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ مجھے یونانی میڈیسن کے آن لائن تعارفی کورس میں پروفیسر غفران احمد سے پڑھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی ایک چیز مجھے یاد ہے وہ اس قدر منکسر المزاج تھے کہ لکچر کے دوران اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی کہتے تھے چنانچہ ایک طالب علم نے آپ سے سوال کر ہی دیا کہ کیوں اپنے آپ کو ایک طالب علم کہہ رہے ہیں جواب میں آپ نے فرمایا ہم لوگ ہمیشہ کچھ نا کچھ سیکھتے ہی رہتے ہیں۔ آج دنیا نے ایک بہت ہی بہترین استاد کھو دیا ہے میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ

اللہ تعالیٰ انکے لئے آسانی پیدا کرے اور انکے اہل خانہ کو صبر دے۔ (**فہمیدہ شاہ**، لندن۔ یو کے)

''انا للہ و انا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ ہمارے پروفیسر پر رحم کا معاملہ فرمائے انکی قبر کو منوّر کر دے اور جنت الفردوس میں بہت بلند مقام عطا کرے۔'' آمین (**سعدیہ بہار**، آئسلے آف وائٹ، یو۔ کے)

''اللہ تعالیٰ ہمارے پروفیسر کو جنت الفردوس عطا کرے۔ اللہ انکے اہل خانہ کو عافیت دے۔'' آمین (**محمد مصطفیٰ خان**، سان جوان، ترینید اڈو بیگو)

''واقعی ہمارے استاد کی رحلت ہمارے لئے اور پورے یونانی طب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے بہت ہی کربناک ہے۔ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہم لوگ آخرت میں دوبارہ اکٹھا کئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے آسانی پیدا کرے۔'' آمین (**شاہدہ چودھری**، ناٹنگھم، یو۔ کے)

''اللھم اغفر لھا وارحمھا''. (**رُکایت ماما عبدالعزیز**، کدونا، نائجیریا)

''انا للہ و انا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو کشادہ کرے اور نور سے بھر دے اور جنت الفردوس میں صالحین کی صحبت نصیب کرے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ آپ کے اہل خانہ اور متعلقین کو اس دکھ بھرے لمحے میں صبر جمیل عطا کرے اور آپ کو دونوں جہانوں میں خیر سے نوازے۔'' آمین (**فوزیہ انجم**، سری نگر، انڈیا)

موت اس کی ہے جس کا کرے زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں جانے کے لیے

اُردو شاعری کے فکری اور انقلابی پہلو

ارشد غازی

شاعر بہت حساس ہوتا ہے۔ سماجی اور سیاسی حالات سے وہ متاثر ہوتا ہے اور یوں اس کی فکر انقلاب کی ایک توانا آواز بن کر اُبھرتی ہے۔ انقلابی شاعری کی مثالیں غزوات کے موقع پر بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور قرونِ وسطیٰ کے مختلف ادوار میں بھی۔ بلا شبہ سماجی تاریخ کے تمام بڑے انقلابات اور سماجی اور سیاسی تبدیلیوں میں تخلیق کاروں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ہمیشہ ہی فن پاروں نے ظلم، سماجی نابرابری اور ناانصافی کے خلاف داخلی بیداری کو پیدا کیا، یہ آواز کبھی بپھر گئی، کبھی طنز و مزاح کے پیرائے میں جلوہ گر ہوئی۔ جس سے عوامی مزاحمت کے پرچم بلند ہوئے۔

اسلامی انقلاب کوئی اعتقادی نعرہ نہیں تھا، بلکہ غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے والا انقلاب تھا۔ یہ روحانی اور شعور و خرد کا انقلاب تھا۔ یہ انفرادی و اجتماعی، اصلاحی و فلاحی انقلاب تھا۔ مزاج و عادت کا انقلاب تھا، معیشت اور تجارت کا انقلاب تھا۔ لیکن اِن سب کے پیچھے قرآنی مزامیر اور انقلابی اور قوانین کو نافذ کرنے والی انصاف کی ایک لمبی تلوار تھی۔ جسے اُن مزامیر و آیات نے آب دی۔

تاریخ میں ایران و اندلس کی فتح ہو یا قدس کی، ترکی کی فتح ہو یا ہند کی، رزمیہ شاعری نے نوجوان دلوں میں جوالامکھی کی تپش کو پیدا کیا۔ الفاظ میں جان ہوتی ہے لیکن شعر! قم بہ اذن اللہ کا اثر رکھتا ہے۔ میرے نزدیک وہ شاعر عظیم ہے، جو الفاظ میں اپنے لہجے کو سمودے۔

۱۷۵۷ء میں نواب شجاع الدولہ نے پہلی آزادی کی جنگ پلاسی کے میدان میں لڑی، داخلی سازشوں کے سبب نواب جنگ ہارا، مگر عظیم آباد کے صوبیدار راجہ صاحب رام نرائن موزوں نے تڑپ کر شعر موزوں کیا:

غزالاں ! تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یہ شمع تو بجھ گئی! لیکن شعر کی اُڑتی چنگاریوں نے دلوں میں آگ بھڑکا دی۔ منشی جیون لال نے ۱۸۵۷ء

کی جنگ شروع ہوتے ہی قلم اُٹھایا اور بادشاہ کو لکھ بھیجا:

لشکرِ اعداء الٰہی آج سارا قتل ہو
گورکھا گوجر سے لے کر تا نصاریٰ قتل ہو

وقت کے انقلابی خرّم علی بلہوری نے مثنوی ’جہادیہ‘ لکھی، جس کے اشعار اگلے مورچوں پر جوانوں کے حوصلے بلند کرتے ہیں:

فرض ہے تم پہ مسلمانو! جہادِ کفّار
اِس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیں دار
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو

۱۸۵۷ء میں محلاتی سازشوں نے پھر رنگ دکھلایا، سقوطِ دہلی نے کلیجے چھلنی کر دیے۔ غالبؔ نے دیوار پر لکھ دیا:

داغِ فراق ِ صحبت ِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اکبرؔ الہ آبادی یوں تو انگریزوں کے تنخواہ دار تھے، لیکن انگریز بہادر اُن کی چٹکیوں سے پریشان تھے۔ فرماتے ہیں:

ایران نے کیا نہ کیا شاہِ روس نے
انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

مزید یوں گویا ہوئے:

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھو کہ آہ بھرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں
میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں

مولانا شبلی نعمانی کے اعتراض کو انگریزی سرکار نے خود کلامی جانا:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک

۱۹۰۸ء کا زمانہ ہے، کشمیری برہمن پنڈت برج نرائین چکبستؔ بھی صبحِ وطن کے متلاشی ہیں، کہتے ہیں:

ہیں باغباں کے بھیس میں گُل چیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

برائے اہلِ علم و دانش کس قدر لطیف طنز ہے اُن کے اِس شعر میں:

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

۱۹۲۰ء میں انقلابی شاعر تراب علی فرماتے ہیں:

جس کا اقبال ہو تنزّل پر
وہ چڑھے فوج لے کے کابل پر

اسے عمرانیات کا علم کہتے ہیں۔ جب آنے والے واقعات کو ایک شاعر برسوں پہلے جاگتی آنکھوں دیکھتا ہے، متنبہ کرتا ہے کہ ہوشیار باش! جو کان دھرتا ہے بچ رہتا ہے، جو نہیں سنتا وہ تاریخ کے صفحات میں گم ہو جاتا ہے۔ چشمِ عبرت نے دیکھا۔ چالیس برس کی قلیل مدت میں افغانستان کے جیالوں نے دو عظیم طاقتوں کو ملیا میٹ کر دیا۔

جملہ معترضہ ہے: ۱۹۰۵ء میں اقبالؔ جو ابھی نوعمر تھے، انھوں نے اپنے کچھ اشعار بغرضِ نظرِ ثانی داغؔ دہلوی کے پاس بھجوائے، جس میں ایک شعر تھا:

کیا مرا تذکرہ جو ساقی سے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سُن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

داغؔ دہلوی نے اشعار دیکھے اور لکھ بھیجا: ''میاں شاعری کرو''۔ اس جملے میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ اصلاح سے پیغام متاثر ہوگا۔ اور اس کے بعد اردو ادب کا بے داغ چاند غروب ہو گیا اور فلاحِ اُمت کا ایک نیا سورج اپنی پوری تابنا کی کے ساتھ طلوع ہوا۔

اقبالؔ کا اقبال بلند ہوتا گیا اور انھوں نے کمان سنبھالی:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ
رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
آ تجھ کو بتا تا ہوں، تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیر ی بحر میں موجوں کا اضطراب نہیں
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پید اتو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مرد ِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کا جگا دو
کاخِ امراء کے درو دیوار ہلا دو

'مشکل' ایک ایسا عذر ہے، جسے تاریخ اور شاعر کبھی تسلیم نہیں کرتے۔

۱۹۳۱ء میں کہی گئی مولانا حامدالانصاری غازیؔ کی ایک نظم 'بیداریٔ مشرق' کے تیور ملاحظہ کیجیے: جس کی طاقت، اُس کی آزادی، اُسی کا اعتبار

ہوشیار اے طالع بیدار مشرق ہوشیار
خوشترآں وقتیکہ مشرق آج پھر بیدار ہے

ہر محاذ جنگ پر ہر مشرقی تیار ہے
فطرت ِ مجبور انساں مائل ِ اظہار ہے
عرصہ ٔ ہستی سے ہستی صورتِ پیکار ہے
وقت آیا ہے کہ اُٹھیں آج پھر مر دانہ وار
ہوشیار اے طالع بیدار مشرق ہوشیار
ایشیا ء میں ہو رہا ہے اہتمامِ انقلاب
دے رہا ہے ہند دنیا کو پیام ِ انقلاب
قدس ہے مجبور آئینِ نظام ِ انقلاب
دیکھنے والی ہے دنیا صبح و شام ِ انقلاب
جس کی طاقت ، اُس کی آزادی، اُسی کا اعتبار
ہوشیار اے طالع بیدار مشرق ہوشیار

سو برس قبل مولانا غازی کی ایک نظم کا اشاریہ یوں لکھا گیا: جیت آخر میں ہماری ہوگی یا ایک اور نظم 'انجامِ تمدّن' کی ابتدا یوں ہوتی ہے: خبر ہے نیا انقلاب آ رہا ہے۔ یہ تھی ہمارے علماء کی دوراندیشی کہ جب تبدیلی محض اک خواب گراں ہے، وہ حالات کی عجیب حوصلہ مند تعبیر پیش کر رہے ہیں۔اُن کی نگاہِ بصیرت کو خوش آئند مستقبل کا ادراک تھا۔

انیس ویں صدی کے اوائل میں ملک کے حالات ایسے تھے کہ جگرؔ مرادآبادی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، جب کہ وہ کبھی کسی انقلابی تحریک سے وابستہ نہیں رہے، مگر انھوں نے استبداد سے آنکھیں ملا کے بات کی اور کہا:

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
کوچے کوچے گوشے گوشے لوٹ مچی ہے لوٹ
جنگل جنگل بستی بستی آگ لگی ہے آگ
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ

ایک جگہ کہتے ہیں:

پرائے ہاتھ جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

سالک کی شاعری کا نمایاں وصف ان کا درسِ عمل، ترغیبِ آزادی اور پیغامِ بیداری ہے، انھوں نے اپنا پرچم یوں بلند کیا:

تا بکے طوقِ غلامی میں رہے گی گردن
جس میں سودائے حکومت ہو وہ سر پیدا کر

زندگی کا عجیب فلسفہ ہے۔ دنیا انہی کو ملتی ہے جو اسے معرفت کے راستے طلب کرے۔ مگر معرفتِ الٰہی اُن پر حرام ہے، جن کے باطن میں دنیا کی محبت رائی کے دانے کے برابر جتنی ہو۔ اسی لئے شاعر بسملؔ عظیم آبادی فرماتے ہیں:

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

شاعرِ انقلاب کے خطاب سے سرفراز جوشؔ ملیح آبادی تو اسی بات کے قائل نہیں تھے کوئی شاعر اپنا تخلص، یاس، حسرت، فراق، مجروح، درد، داغ رکھے۔ وہ فرماتے تھے تخلص کو ولولہ انگیز ہونا چاہئے۔ اُن کا تخلص بھی ولولہ انگیز تھا اور شاعری بھی۔ کہتے ہیں:

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

۱۹۴۲ء میں جب کریپس (Cripps) مشن ہندوستان آیا تو جوشؔ بین السطور سے نکل کر اخبار کی شاہ سرخی بن گئے، کہتے ہیں:

بڑی کاریگری کے ساتھ شاطر نے تراشے ہیں
نئے دھوکے، نئے حیلے، نئے چکمے، نئے جھانسے
ہزاروں تجربوں کے بعد اب یہ عقل آئی ہے
کسے تھپکے، کسے گھرکے، کسے چھوڑے، کسے پھانسے

یہاں تک کہ وہ اپنا آپا کھو دیتے ہیں اور ناگواری سے خطاب کرتے ہیں:

اے ہند کے ذلیل غلامانِ رو سیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ
تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر

انقلابی شاعری انقلابی نعرہ ہوتی ہے جو زمان و مکان کی قیود سے ماوراہوتی ہے۔ فیض احمد فیضؔ کہتے ہیں:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزوٗ لے کر
بڑھے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
متاعِ لوح و قلم چھن گئے تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لیں ہیں انگلیاں میں نے
جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
ہم پرورش ِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اگر ہم غور کریں تو برصغیر کے حالات کم وبیش ایک سے ہیں۔ آج سے نہیں برسوں سے۔ برسوں قبل کہے گئے اشعار کی معنویت آج بھی تازہ ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ معروف شاعر احمد فراز کو حکومتِ وقت سے پیغام دیا گیا کہ وہ خاموش رہیں۔ لیکن جگر صاحب کہہ چکے تھے کہ:

پرواز مری جو روک سکے ایسی بھی کوئی دیوار اُٹھا

احمد فرازؔ نے ایک نظم بعنوان 'محاصرہ' کہی اور شائع کروادی۔ کہتے ہیں:

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
تجھے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے
سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لئے
کہ مجھ کو حرص ِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوت ِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کرکے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سُبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

فرازؔ جب پابند سلاسل ہوئے، تو سبطِ علی صبا نے اُس سر کا خراج ادا کیا۔ بولے:

سچائیوں کا جن کے سروں میں جنون تھا
ہر شہرِ یار وقت نے وہ سر اُڑا دیے

زندہ دلان حیدرآباد کے انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نے آزادی سے اِدھر بہت واضح پیغام دیا:

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جناں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھر پور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
اِس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
ایک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

حسن نعیم نے اپنا زاویۂ نگاہ یوں سامنے رکھا:

کچھ اصولوں کا نشہ تھا، کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

آزاد فضا کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ انبیہٹہ پیر کے اقبال عظیم شمع آزادی کو جلانے کے لئے الاؤ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور فرنگی سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

اُتر کر قصرِ عالی سے ہمارے روبرو آؤ
بلندی سے ہمارے قد کا اندازہ نہیں ہوتا

اقبال عظیمؔ نابینا تھے، لیکن انھوں نے دیدہ وروں کو سوالیہ نشان بنا دیا۔ کہتے ہیں:

مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انھیں بھی نظر نہیں آتا

عوام کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے اور خواص کو فکری راہ دینے والے کچھ اشعار:

امیرؔ مینائی

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

ندؔا فاضلی

ہر ایک بات کو چپ چاپ کیوں سُنا جائے
کبھی تو حوصلہ کرکے نہیں کہا جائے

امیرؔ آغا قزلباش

مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا
اِسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا

قابل اجمیری

رنگِ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

نازشؔ پرتاپ گڑھی

نہ ہو گا رائیگاں خونِ شہیداں ِ وطن ہرگز
یہی سرخی بنے گی ایک دن عنوانِ آزادی

رامپور کے اظہرؔ عنایتی حکومت کی بے جا تحریکات اور عمل کو تماشے سے تعبیر کرتے ہیں۔اور عوام کی فکری بے حسی کو خوب پیرایہ اظہار عطا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

وہ تازہ دم ہیں، نئے شعبدے دکھاتے ہوئے
عوام تھکنے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

سویت یونین جب فعال تھا تو وہ ہندو پاک میں لاتعداد شعراء کو اشتراکیت کی ترسیل کے لئے ماہانہ وظائف ملتے تھے۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ اس کی اعلیٰ قیادت اُردو شاعری کی تلوار کی آب اور کاٹ دونوں کو سمجھتی تھی۔

۱۹۴۷ء میں گلستانِ ہند میں بہار آئی۔لیکن سارے ملک میں خزاں رسیدہ ہوائیں چلنے لگیں ہیں، مسلم کش فساد پھوٹ پڑے۔ بنگال سلگ اُٹھا۔ مرکز اپنے ایک انتہائی متعصب آئی اے ایس افسر 'پھول چند' کو خصوصی اختیارات دے کر بنگال بھیجتا ہے۔اخبار 'مدینہ بجنور' کے ایڈیٹر اپنے اداریہ کی ابتدا کرتے ہیں:

ہاں ! بہار آئی تو ہے گلشن میں لیکن اِس طرح
درمیاں کانٹوں کے مرجھائے ہوئے ہیں پھول چند

راقم الحروف نے بھی وقت کے تقاضے پورے کیے۔ جب حکومتِ وقت نے رعونت کے ساتھ فرمان جاری کیا کہ دانشور اپنے اپنے قلم رکھ دیں، تو ارشد غازیؔ نے قلم اُٹھالیا اور انقلاب کا اشاریہ یوں تحریر کیا:

یارب ! نفس نفس کو ہو عرفانِ انقلاب
حجّت ہوئی تمام ! ہو اعلانِ انقلاب
جس دن بھی سمت پاگیا بحرانِ انقلاب
روکے سے پھر رُکے گا نہ طوفانِ انقلاب
وقت آئے جب ! صفاتِ علیؓ کا نقیب بن
مدِّنظر رہیں ترے سلطانؐ انقلاب
بحرانیٔ حیات کو سمجھا ہے زندگی
اے نسلِ نو ! تو دیکھنا اب شانِ انقلاب
شوقِ جہاد، شعلۂ بیتاب اور ہو
پیشِ نظر ! زمانۂ افغانِ انقلاب
رمزِ خودی کو دیکھا بقلبِ نگاہ بیں
اقبالؒ کا کلام ہے دیوانِ انقلاب
مسندِ امامت کو کیوں نہ ہم سنبھالیں سب
پھر قرونِ وسطیٰ کی دیں وہی مثالیں سب
جہادِ وقت گر موقوف ہو گا.
رہے گا کون پھر دنیا میں غازیؔ

سیاست میں نہ کوئی کسی کا مستقل دوست ہوتا ہے اور مستقل دشمن۔ جب ہم حزبِ اختلاف کو دشمن سمجھ لیتے ہیں۔ تب! یا محلاتی سازشوں کا ادراک وقت کے چلتے نہیں کر پاتے، تب! یا بیرونی طاقتیں آپ کی داخلی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ تب! ہم خود اپنے حق میں غلط فیصلے کرتے ہیں، جس کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے، جس کا دورانیہ عموماً لامحدود ہوتا ہے۔ یہاں کچھ تغیر لفظی کے ساتھ مظفر رزمیؔ کا شعر نقل کرنا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

تاریخ کے عہدوں نے وہ دور بھی دیکھے ہیں
لمحوں نے خطا کی ہے صدیوں نے سزا پائی

ہندوستان کے موجودہ حالات اتفاق نہیں۔انگریزوں نے جو نفرت کا بیج بویا تھا، وہ اب برگ و بار لا رہا ہے۔ایک دفعہ پھر شعراء اور ادباء پر بڑی بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے کہ وہ حالات سے باخبر رہیں اور انقلابِ وقت کی تائید اپنے کلام اور تحریر سے کرتے رہیں۔انقلابی شاعری وقت کا تقاضا ہے۔

راحتؔ اندوری کہتے ہیں:

اب تو جو فیصلہ ہونا ہے یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

مرکزی بھٹکی ہوئی قیادت کو انقلاب کے دھاروں اور نعروں سے موڑا جاتا ہے۔بغاوت کارگر نہیں ہوتی۔
علاّمہ اقبالؔ کے اِس پیغام کے ساتھ حجّت تمام کہ

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

طرحی غزل

سرفراز بزمیؔ

کل جہاں شور تھا ظلمت سے صف آرائی کا
بس دھواں ہی وہاں افکار میں پسپائی کا

اب اجالے ترے خورشید سے مانوس نہیں
شب گزیدہ ہے سویرا تری دانائی کا

توڑ اے! نالہء شب دام سکوت صحرا
'رنگ بدلے کسی صورت شب تنہائی کا'

شام گہرائی، کہیں قتل ہوا پھر سورج
رخ لہو رنگ ہوا گنبد مینائی کا

قہقہوں میں دبی آہوں کو دبائے رکھا
تاکہ ٹوٹے نہ بھرم ان کی مسیحائی کا

کاخ و کو سب ترے انوار سے روشن روشن
پھول خاموش ترانہ تری یکتائی کا

دشت کنعاں سے کہ قابیل سے پوچھا جائے
کتنا حق ہوتا ہے بھائی پہ کسی بھائی کا

ایک نادیدہ سی مخلوق سے سب ہار گئے
ہم کو غرہ تھا بہت شوکت و دارائی کا

کیسے کیسے تری محفل سے قدح خوار گئے
کیا بھروسہ ہے ترے بزمی صحرائی کا

غزل

ڈاکٹر فیاضؔ احمد علیگ

زلفیں جو بکھیری تو سیاہ رات ہوئی ہے
چہرہ جو کھلا نور کی برسات ہوئی ہے

جن لوگوں سے ملنے کی تمنا نہیں ہوتی
اکثر انہیں لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے

اک سیلِ رواں لے گیا غم سارے بہا کر
آنکھوں سے مری آج وہ برسات ہوئی ہے

اک زخم نیا دل کو مرے دے کے گیا ہے
ظالم سے مری جب بھی ملاقات ہوئی ہے

دنیا سے تو فیاضؔ سدا جیت کے آیا
اپنے ہی قبیلے میں مگر مات ہوئی ہے

جامعہ کے لیل ونہار

جامعہ میں نئی تقرریاں

۳۰/مئی ۲۰۲۱ء بروز یکشنبہ جامعہ میں مختلف شعبہ جات کے لیے انٹرویو منعقد ہوئے، جس میں درج ذیل لوگوں کی نئی تقرری عمل میں آئی:

۱۔عبدالہادی	شعبۂ مالیات
۲۔شاہد عبدالحق فلاحی	دفتر رابطۂ عامہ
۳۔محمد علقمہ فلاحی	دفتر امتحانات
۴۔محمد رافع فلاحی	دفتر تعلیمات
۵۔محمد یوسف	شعبۂ میڈیا ہاؤس

اللہ تعالیٰ تمام نو واردین کو اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اعلان عام برائے طلبہ وطالبات

۷/ جولائی ۲۰۲۱ء بروز یکشنبہ طلبہ و طالبات کے لیے ایک عام اعلان مہتمم تعلیم و تربیت جناب ڈاکٹر جاوید سلطان فلاحی کی جانب سے کیا گیا کہ عربی اول کے وہ طلبہ وطالبات جن کا سال گزشتہ امتحان نہیں ہوا تھا، نیز جو ضمنی میں تھے، ان کی کلاس ۲۶/مئی ۲۰۲۱ء سے جاری ہے۔ اعلان کے مطابق ان کا امتحان ۱۵/تا ۱۸/جولائی ۲۰۲۱ء ہوگا۔ امتحان آن لائن اور اردو زبانی ہوگا۔ کام یاب ہونے کی صورت میں ہی وہ عربی دوم میں جائیں گے۔

جن طلبہ وطالبات نے کسی عذر کی وجہ سے سارے امتحانات چھوڑ دیے تھے اور پیشگی درخواست دے دی تھی، ان کے بارے میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فی الحال اسی درجہ میں تجدید کرائیں، عیدالاضحیٰ سے قبل ان کے امتحانات لیے جائیں گے اور کام یابی کی صورت میں وہ اگلے درجے میں چلے جائیں گے۔ ایسے طلبہ و طالبات کا بھی امتحان آن لائن اور زبانی ۱۵/تا ۱۸/جولائی ہوگا۔

شعبۂ حفظ میں اردو ہندی اورانگریزی میں ضمنی آنے والے طلبہ وطالبات، جن کو اگلے درجے میں ترقی دے دی گئی ہے، ان کے بیک پیپر باقاعدہ مدرسے کھلنے اورآف لائن تعلیم شروع ہوجانے کے بعد ہوں گے۔ ان تاریخوں کا اعلان اُسی وقت کیا جائے گا۔

درجۂ ہشتم، حفظ ششم اور عربی اول کے جائزے میں ناکام طلبہ وطالبات درجہ اعدادیہ میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ داخلہ کے خواہش مند طلبہ/طالبات درخواست دے دیں۔ مطلوبہ تعداد پوری ہونے پر درجہ کھولا جائے گا۔ درجہ اعدادیہ میں تعلیمی فیس ماہانہ ۵۰۰/روپے ہے۔

داخلہ وتجدید داخلہ کی آخری تاریخ ختم ہوگئی ہے۔ اب کسی کی داخلہ یا تجدید داخلہ کی درخواست منظور نہیں کی جائے گی۔

شعبۂ ابتدائی کے استاد محمد یحییٰ صاحب کو صدمہ

۱۸/جون ۲۰۲۱ء بروز جمعہ شعبۂ ابتدائی کے استاد محمد یحییٰ صاحب ساکن بلریا گنج کے فرزند محمد ارسلان یحییٰ اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

محمد ارسلان یحییٰ جامعہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پچھلے سال عربی اول کا امتحان دیا تھا۔ طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے ایک دو پیپر چھوٹ گئے تھے۔ مرحوم پیٹ کی بیماری میں مبتلا تھے۔ عمر تقریباً سولہ سال تھی۔ درجے کے محنتی اور مثالی طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ محمد ارسلان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اخبارانجمن

مولانا صباح الدین ملک فلاحی

صدر کے آن لائن انتخابی عمل سے متعلق بعض اہم امور کی وضاحتیں

(آن لائن انتخاب برائے میقات ۲۰۲۱ء تا ۲۰۲۴ء)

۶؍جون ۲۰۲۱ء کو انجمن کے نئے صدر برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی فلاحی کا آن لائن انتخاب عمل میں آیا۔ یہ صدر کے آن لائن انتخاب کا پہلا تجربہ تھا، اس لیے انتخاب سے قبل اور بعد، اس پر متعدد لوگوں کی جانب سے کچھ اشکالات کا اظہار کیا گیا۔ بحیثیتِ رکن انتخابی کمیٹی راقم نے نمائندگان کے واٹس ایپ گروپ پر ان کے بارے میں وضاحتیں کیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

اس وقت گفتگو کے لیے ہمارے سامنے بنیادی طور پر چار (۴) نکات ہیں:

۱۔ نکتہ اول: انتخاب کے لیے تین مراحل کیوں رکھے گئے؟ ایک یا دو یا چار کیوں نہیں؟

۲۔ نکتہ دوم: پہلا مرحلہ

(الف) ناموں کی تجویز کے پہلے مرحلے میں تجویز کردہ ناموں کے ساتھ ہر ایک کے حق میں مجوزین کی تعداد کیوں نہیں بتائی گئی؟

(ب) کسی تجویز کردہ نام کی قبولیت کے لیے کم از کم دو ارکان کے اتفاق یا تائید کی قید کیوں لگائی گئی؟

(ت) ناموں کو ووٹوں کی تعداد کے بجائے الفبائی ترتیب سے کیوں لکھا گیا؟

۳۔ نکتہ سوم: دوسرا مرحلہ

(الف) دوسرے مرحلے میں تین ناموں کا انتخاب کیوں، دو کا کیوں نہیں؟ جبکہ دو کے درمیان ووٹنگ کی صورت میں کم از کم ۵۱؍فیصد ہر حال میں حاصل ہو سکتا ہے جو کہ صدر کے انتخاب میں مطلوب اور پسندیدہ ہے۔

(ب) اس مرحلے میں ترجیح اول اور ترجیح ثانی کے طور پر دو نام تجویز کرانے کا مقصد کیا ہے؟

(ت) تمام ناموں کے ساتھ کل ترجیحی ووٹ کی تعداد کیوں نہیں بتائی گئی؟

(ث) ناموں کو الفبائی ترتیب سے کیوں لکھا گیا، ووٹوں کے اعتبار سے کیوں نہیں؟

۴۔نکتہ چہارم: تیسرا مرحلہ

تیسرے (آخری) مرحلے میں تینوں ناموں کے حق میں آئے ہوئے حتمی ووٹ کی تعداد کیوں ظاہر نہیں کی گئی؟

چندمزید نکات ہیں جو ضمنی نوعیت کے ہیں، نیز کچھ سوالات اور اشکالات ہیں، ان سب کی وضاحت ان شاء اللہ کی جائے گی۔

....

☆**سوال: نکتہ نمبر ا:** انتخاب کے لیے تین مراحل کیوں رکھے گئے؟ ایک یا دو یا چار کیوں نہیں؟

وضاحت: اصل میں جب سے نمائندگان کے واسطے سے انتخاب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، یہی تینوں مراحل گذشتہ پانچوں انتخابات میں اختیار کیے گئے ہیں۔ مثلاً اسی میقات کا آف لائن صدارتی انتخاب جو کہ ۷/ مارچ ۲۰۲۱ء کو جامعہ میں منعقد ہوا اور جس میں برادرم جاوید سلطان صاحب صدر منتخب ہوئے، اس میں سب سے پہلے ناموں کی تجویز لی گئی۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔

پیش کیے گئے ۱۲ ناموں پر، انہیں ایوان سے باہر بھیج کر مختصر گفتگو ہوئی اور نتیجتاً تین نام سامنے آئے۔ یہ دوسرا مرحلہ تھا۔

ان تین ناموں پر فائنل ووٹنگ ہوئی اور بالآخر کثرتِ رائے سے ایک ساتھی کا انتخاب ہوا۔ یہ تیسرا مرحلہ تھا۔

تین مراحل پر مبنی طریقہ اس سے پہلے برادرم مشرف حسین صدیقی صاحب کے انتخاب کے وقت اختیار کیا گیا اور یہی طریقہ برادرم رضوان رفیقی صاحب اور برادرم ملک محمد فیصل صاحب کے انتخابات کے وقت اپنایا گیا۔

فرق صرف یہ ہے کہ یہ سب آف لائن انتخابات تھے، اور مجوزہ تمام ناموں پر ضروری گفتگو کر کے دوسرا مرحلہ طے کرتے تھے۔

موجودہ آن لائن انتخاب میں ناموں پر گفتگو نہیں رکھی گئی۔

☆**دوسرا سوال:** مجوزین کی تعداد کیوں ظاہر نہیں کی گئی؟

نکتہ نمبر ۲ (الف): ناموں کی تجویز کے پہلے مرحلے میں تجویز کردہ ناموں کے ساتھ مجوزین کی تعداد کیوں نہیں ظاہر کی گئی؟

نکتہ نمبر ۳ (ت): تمام ناموں کے ساتھ کل ترجیحی ووٹ کی تعداد کیوں نہیں بتائی گئی؟

نکتہ نمبر ۴: آخری مرحلے میں تینوں ناموں کے حق میں آئے حتمی ووٹ کی تعداد کیوں نہیں ظاہر کی گئی؟

وضاحت: پہلے مرحلے کا مقصد عہدہ صدارت کے لیے ناموں کی صرف تجویز لینی ہے۔ کسی کا نام کتنے لوگوں نے تجویز کیا ہے، اس تعداد کی اس مرحلے میں کوئی قیمت نہیں رکھی گئی ہے۔ اس لیے اس تعداد کو بتانے کا کوئی مطلب نہیں ہے، بلکہ انتخاب کے اگلے مراحل کو متاثر کرنا ہے۔

دوسرے مرحلے میں ۱۹ر مجوزہ ناموں پر موصول ہوئے ترجیحی ووٹوں کی تعداد بتانا بھی اگلے مرحلے کو متاثر کرنا ہوتا۔ ترجیحی تجاویز کا مقصد تو صرف ۱۹ میں رایوں کے بکھراؤ کو روکنا اور چند نسبتاً مقبول ناموں تک محدود کرنا تھا، نہ کہ ووٹوں کی تعداد اور کسی کے حق میں یا خلاف اس کی کثرت وقلت کا پتہ لگانا۔

آخری مرحلے کی فائنل ووٹنگ میں ووٹ کی تعداد کی اصل قیمت تھی۔ یہاں تعداد ہی فیصلہ کن تھی۔

نتیجے کے اعلان کے وقت ہر امیدوار کو ملے ووٹوں کی تعداد بتانا چاہیے یا نہیں، اس پر دو رائے ہوسکتی ہے۔ البتہ جس بات پر انجمن کے تمام گزشتہ انتخابات میں عمل ہو رہا ہے، وہ یہی ہے کہ تعداد کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ آئندہ شوریٰ کو طے کرنا ہوگا کہ اس کا اظہار نتیجے کے اعلان ساتھ کیا جائے یا نہیں؟

☆ **تیسرا سوال:**

نکتہ نمبر۲ (ب): کسی تجویز کردہ نام کی قبولیت کے لیے کم از کم دو ارکان کے اتفاق یا تائید کی قید کیوں لگائی گئی؟

وضاحت: آپ نے اس انتخاب میں دیکھا کہ صدارت کے لیے انیس ناموں کی بڑی تعداد تجویز کی گئی۔ ان میں دس نام ایسے تھے جس کو نمائندگان کی اتنی بڑی تعداد میں سے صرف ایک رکن نے تجویز کیا تھا۔ اگر یہ دس نام حذف کر دیے جاتے تو ارکان صرف نو میں سے تین کا سلیکشن کرتے۔ ایسا نہ ہونے سے زیادہ دائرہ بڑھ گیا اور بہت سی ترجیحی رائیں بالکل ضائع ہوگئیں۔

اس مسئلہ میں دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ کمیٹی کی رائے تو یہی ہے کہ تجویز میں کم از کم کسی نام پر دو ارکان کی موافقت کی قید ہونی چاہیے۔

☆ **چوتھا سوال:** مجوزہ ناموں کے اظہار میں الفبائی ترتیب کیوں؟

نکتہ نمبر۲ (ت): مجوزہ ناموں کو ووٹوں کی تعداد کے بجائے الفبائی ترتیب سے کیوں لکھا گیا؟

نکتہ نمبر۳ (ث): آخری طور پر منتخب تین ناموں کو الفبائی ترتیب سے کیوں لکھا گیا؟ ووٹوں کے اعتبار سے کیوں نہیں؟

وضاحت: 'تجویز' والے مرحلے میں اور 'ترجیحی ناموں' والے مرحلے میں ناموں کی ترتیب الفبائی رکھنے کا

مقصد واضح ہے۔

ظاہر ہے ان دونوں مواقع پر ووٹ مقصود نہیں ہے، اور یہ بھی راز میں رکھنا ہے کہ کس کو کتنے لوگوں نے سادہ طور پر یا ترجیحی طور پر تجویز کیا ہے۔

اصل مقصد انتخاب کو 'آزادانہ' رکھنے کے لیے ارکان کی رائے کو دوسروں کی تاثیر سے بچانا ہے۔

☆ پانچواں سوال:

نکتہ نمبر ۳ (الف): دوسرے مرحلے میں تین ناموں کا سلیکشن کیوں، دو کا کیوں نہیں؟ جب کہ دو کے درمیان ووٹنگ کی صورت میں کم از کم ۵۱ فیصد ہر حال میں حاصل ہوسکتا ہے جو کہ صدر کے انتخاب میں مطلوب اور پسندیدہ ہے؟

وضاحت: اس معاملے کے ۵ درج ذیل پہلو ہیں:

۱۔'دو کے درمیان' ووٹنگ سے آمنے سامنے مقابلہ آرائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ رائے دہندگان کے درمیان سیدھی کشمکش پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ تین ہوجانے سے یہ احساس کم ہوجاتا ہے بلکہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ متوازی اور مقابل کے بجائے مثلث کی شکل رکھی جائے، انتخاب سہ رخی ہو۔

۲۔ ہم لوگ مختلف نسبتوں کے ساتھ ایک اجتماعیت سے منسلک ہیں: فکر و تنظیم کی نسبت، بود و باش کی نسبت، مصالح و منافع کی نسبت وغیرہ۔

اگر دو افراد آمنے سامنے ہوں گے تو یہ نسبتیں فعال ہوسکتی ہیں اور ہماری اس مقصدی اجتماعیت پر مضر اثرات ڈال سکتی ہیں۔ اس سے بچنا بہرحال مطلوب ہے۔

۳۔ کبھی دو کی صورت میں لوگ ''متفقہ صدر'' بنانے کے موڈ میں آجاتے ہیں اور اعلان کرانا چاہتے ہیں کہ فلاں صاحب ''بالاتفاق صدر'' چنے گئے۔ یہ ایک غیر فطری خواہش ہے۔ انسانی اجتماعیات میں اتفاق طبعی چیز نہیں ہے بلکہ مصنوعی ہے۔ طبعی چیز ''اختلاف'' ہے۔ اس لیے ''متفق علیہ صدر'' بنانے کے خیال و عمل اور غیر فطری خواہش کو روکنا ہے۔ یہ مصلحت بھی ہے کہ اختیار و منصب کی کرسی پر بیٹھنے والے کے ساتھ ''اتفاق'' کے نام پر ''تقدس'' کا ہالہ نہ قائم کردیا جائے اور اسے یہ احساس بھی رہے کہ ووٹروں کی ایک تعداد کی ترجیح آپ نہیں تھے۔ توازن برقرار رہے۔

۴۔ لوگوں کو 'دو میں سے کسی ایک کو' ووٹ دینے کے بجائے ''تین میں سے کسی ایک کو' ووٹ دینے والی صورت میں زیادہ وسعت و کشادگی ہے، جبکہ پہلی صورت میں ان کا حق و اختیار غیر ضروری طور پر محدود ہوتا ہے۔

۵۔ اس کا ایک مقصد انتخاب کو ''مینج کرنے'' کو مشکل بنانا ہے۔ اگرچہ ہماری انجمن خاص انسانوں (دینی تعلیم یافتہ اور نیک صفت) مسلمانوں کی جمعیت ہے پھر بھی یہ انسانوں کی انجمن ہے۔ مختلف عوامل کو استعمال کر کے انتخاب کو مینج کرنے کی خواہش اور کوشش کہیں بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ تین کی صورت میں یہ کچھ مشکل ضرور ہو جائے گا۔

جہاں تک صدر کے ۵۱ فیصد ووٹروں کے ذریعے منتخب ہونے کا تعلق ہے، یہ مذکورہ منافع و مضار کے مقابلے میں زیادہ اہم بات نہیں ہے۔

ویسے یاد دلائیں کہ گزشتہ ۷؍مارچ ۲۰۲۱ء کا انتخاب ۵۱ فیصد کی قید لگائے بغیر منعقد ہوا۔ پھر بھی تین میں سے اول آنے والے کو خود بخود حاضر ارکان کا ۵۱ فیصد ووٹ حاصل ہوا۔

یہ حالات پر منحصر ہے۔ ۵۱ فی صد سے کم یا زیادہ دونوں ہوسکتا ہے۔ اس میں فکر مندی کی کوئی بات نہیں ہے۔

☆ چھٹا سوال:

نکتہ نمبر ۳ (ب): دوسرے مرحلے میں ترجیحِ اول اور ترجیحِ ثانی کے طور پر صدارت کے لیے دو نام تجویز کرانے کا مقصد کیا ہے؟

وضاحت: اس سے ہمیں یہ موقع ملتا ہے کہ اگر ہماری پہلی پسند نہیں ملتی تو دوسری مل جائے۔ سب کی دونوں ترجیحات کو جمع کرنے سے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ کن کے حق میں صدارت کے لیے رائے رکھتے ہیں۔ اس طرح مجوزہ بہت سے ناموں میں سے تین زیادہ مقبولیت والے ناموں کو الگ کر لیتے ہیں۔

صرف ایک ہی نام پیش کرنے میں تنگی ہے۔ اس کے سلیکٹ نہ ہونے پر ہماری کوئی رائے ٹیبل پر موجود نہیں رہتی۔ دو نام والی صورت میں ہمارے حقِ انتخاب و اختیار کو زیادہ تسلیم کیا گیا ہے۔

....

چند مزید وضاحتوں کا بیان

رایوں کی وصول یابی اور رائے شماری کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اپنایا گیا۔ اس بات سے انتخاب کی پہلی نوٹس میں سب کو آگاہ بھی کر دیا گیا تھا۔

اس طریقہ میں ہر ووٹ کے مرکز انتخاب تک پہنچنے، اس کے درست طور پر اندراج ہونے اور شمار کیے جانے کو الحمدللہ یقینی بنایا گیا۔

انتخاب میں رائے کی وصولی، اس کے اندراج اور کاؤنٹنگ پر بعض ارکانِ نمائندگان کی طرف سے شک وشبہہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان بعض میں سے بھی 'بعض' کو کارکردگی سے بڑھ کر نیتوں پر بھی شبہہ ہے۔ ان تمام حضرات سے، ہم سب نمائندگان گروپ پر واقف ہیں۔ انہوں نے اپنے معتمد لوگوں کے ذریعے ری کاؤنٹنگ کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ ہمارے نزدیک وقتِ ضرورت ری کاؤنٹنگ میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ہم نے رائے شماری ٹیم کے لیے جو تہہ دار طریقہ تجویز کیا تھا، اس میں اس پورے عمل کی صحت کو یقینی بنانے کا انتظام کیا۔ اس کی مختصر وضاحت دوبارہ کر دینا مفید ہوگا۔

برائے وصولی رائے:

۱۔ دو الگ الگ موبائل پر تحریری رائے دہی۔

۲۔ دو الگ الگ موبائل پر صوتی رائے دہی۔

۳۔ وصول شدہ ووٹوں کو الگ الگ ورقوں پر بوقتِ وصولی اندراج۔

۴۔ وصولی کے وقت کے اختتام پر موبائل سے مندرجات کو ملانا۔

۵۔ دونوں ورقوں کو آپس میں ملانا۔

برائے شمار:

۱۔ دونوں ورقوں پر الگ الگ گنتی۔

۲۔ دونوں گنتیوں کو ملانا۔

تینوں مراحل کے مطابق الگ الگ تین خاص ورقے (شیٹ) حلقہ ہائے نمائندگان کے اعتبار سے تیار کر لیے گئے تھے، جن پر وصول شدہ رائیں متعلق ناموں کے سامنے درج کی جاتی تھیں، تاکہ کوئی رائے چھوٹنے نہ پائے اور پتہ چلے کہ کس کی رائے نہیں آئی۔

اس پورے عمل کو صرف رائے شماری ٹیم نے دفترِ انجمن میں صبح آٹھ بجے سے رات نو بجے تک انجام دیا۔ انہیں اس کام کے لیے مہتممِ جامعہ کی طرف سے ''بکارِ جامعہ'' رخصت دی گئی تھی۔

ان کے ساتھ انتخابی کمیٹی کے ممبران بھی پورے وقت موجود رہے۔ یہ ممبران براہِ راست اس عمل میں شریک نہیں تھے۔

اس پورے عمل کے مطابق نتائج کا اعلان کیا گیا۔

انتخابی کمیٹی کے کسی ممبر نے نتائج کے سوا کسی ورقہ پر کوئی نظر نہیں ڈالی۔ ان کا کام صرف باہمی مشورے

سے عمل کو آگے بڑھاتے رہنا تھا۔ انتخابی کمیٹی شوریٰ اور صدر کے انتخابات میں ایسا ہی کرتی رہی ہے۔

....

مؤرخہ ۹ رجون انتخابی کمیٹی کی مشاورت پر، کنو ینز کمیٹی کی ہدایت کے مطابق دیگر دونوں ممبرانِ کمیٹی نے ٹیم کے دونوں ممبران کے ساتھ بیٹھ کر دونوں موبائل سے الگ الگ دونوں ورقوں کو از سرِ نو، اول تا آخر ملایا، اور آخر میں کاؤنٹنگ کی۔ الحمدللہ نتائج بعینہٖ حسبِ سابق نکلے۔

ابھی ہم نے دونوں موبائل کے متعلقہ مواد کو محفوظ رکھا ہے۔ (نوٹ: ہم نے موبائل سے تمام میسج کیے ہوئے حتمی ووٹوں کو اسکرین شاٹ لے کر، ان کا پرنٹ آؤٹ نکال لیا ہے۔ اب یہ ریکارڈ الحمدللہ زیادہ محفوظ ہو گیا ہے۔ مؤرخہ ۲۰۲۱/۶/۲۶ء)

رائے شماری کی صحت کی جانچ:

۱۔ 'بعض' ساتھیوں کے لیے رائے شماری کی صحت کو چیک کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ ہم سے اپنے ووٹ کے مرسَل لہٗ کا نام پوچھیں، (اپنے ووٹ کے بارے میں پوچھیں کہ کس کے حق میں درج ہے) ہم نام بتائیں گے، اگر انہیں یہ غلط لگے تو اپنے ووٹ کا اسکرین شاٹ بھیجیں، یا ہم ان کے ووٹ کا اسکرین شاٹ بھیجیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جیسا کہ 'بعض' لوگ خواہش رکھتے ہیں، دفترِ انجمن تشریف لا کر یا اپنے مقام ہی سے اپنا ایک وکیل پیش کریں، جو اُن کا یہ کام کرے، ہم پورا تعاون کریں گے۔ وہ ہمارے مہمان ہوں گے۔

اللھم ألھمنا رشدنا، آمین۔

نمائندگانِ انجمن کا انتخابی عمل: ایک وضاحت

مارچ ۲۰۲۱ء میں انجمن کی نئی میقات (اپریل ۲۰۲۱ء تا مارچ ۲۰۲۴ء) کے ارکانِ شوریٰ اور صدر کا انتخاب نمائندگان کے ذریعے عمل میں آیا۔ راقم اُس انتخابی کمیٹی کا کنو ینز تھا۔ انتخابات کے بعد بعض احباب نے متعدد امور کی وضاحت کے لیے مجھ سے رابطہ کیا۔ اُس وقت میں نے ایک وضاحتی تحریر لکھی تھی، جو حسبِ ذیل ہے:

سب سے پہلی بات یہ کہ انجمن کا انتخابی عمل متعدد اصلاحات اور اقدامات کا محتاج ہے۔ غالباً رواں میقات میں بعض دیگر اہم امور کی طرح یہ شعبہ بھی متعدد اصلاحات سے گزرے گا۔

رواں میقات کے نمائندگان کے لیے گزشتہ سال جنوری و فروری ۲۰۲۰ء میں لاک ڈاؤن سے پہلے انتخابی عمل انجام پایا تھا۔

اس وقت سب سے بنیادی مسئلہ یہی تھا کہ تمام فلاحیوں سے رابطہ کر کے ان کا ووٹ کیسے حاصل کیا جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اب تک یعنی ممبر شپ کی تمام فلاحی فارغین تک توسیع سے پہلے پہلے، انتخاب اور انتخابی حلقوں کا اسٹرکچر، انجمن کی محدود دائرہ والی ممبر شپ کی بنیاد پر بنا تھا، اور 26 انتخابی حلقوں میں تقسیم تھا۔

بنیادی طور پر ان ہی حلقوں کے ممبروں کی فہرست اور کسی قدر اپڈیٹیڈ موبائل نمبر موجود تھے۔

☆ ان ممبروں تک انتخابی دفتر کی رسائی:

اولاً زیادہ تر انجمن کی یونٹوں کے واسطے سے تھی جو ان 26 حلقوں میں سے تقریباً 18 مقامات پر قائم تھی۔

رابطہ کا دوسرا ذریعہ مذکورہ حلقوں کے ممبروں کے موبائل نمبر تھے جو دفتر کے ریکارڈ میں درج تھے اور جن میں سے زیادہ سے زیادہ 30 فیصد کام کے لائق تھے۔ حتی الامکان ان تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

تیسرا ذریعہ فلاحیوں کے متعدد واٹس ایپ گروپ تھے۔ لاک ڈاؤن سے پہلے فلاحیوں کے ان گروپ کی رسائی فارغین تک بہت محدود تھی۔ سارے گروپ پر اعلان کے باوجود ہمارا رابطہ محدود حلقہ تک تھا۔

چوتھے، ہر فلاحی جس کا ووٹ دفتر پہنچتا تھا، اس سے جواب میں لازماً اپیل کی جاتی تھی کہ براہِ کرم فلاحیوں سے ووٹنگ کرانے میں مدد کریں اور اس انتخابی اطلاع و اعلان کو دور تک پہنچائیں۔

بہر حال، انجمن کی تینتالیس (۴۳) سالہ تاریخ میں پہلی بار جب ممبر شپ کا دروازہ تمام فلاحیوں پر کھلا تو پہلے کے مقابلہ میں اچانک ممبران کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ ان کا اندراج پہلے سے بنے انتخابی حلقوں اور ممبرز کی لسٹ میں کہیں نہیں تھا۔ ان تک پہنچنا ایک وقت طلب کام ثابت ہوا اور جو نتیجتاً محدود رہا۔

تاہم انتخاب میں اس بار زیادہ وسیع حلقے سے نمائندگی ہوئی۔

کرونا لاک ڈاؤن کے بعد ان حالات میں ایک خاص تبدیلی آئی۔ فلاحیوں کے واٹس ایپ گروپس بڑی تعداد میں بنے، انجمن کی طرف سے اور جامعہ کی ضرورتوں کے تحت بھی۔ جامعہ کی مالیات کو سنبھالنے کے لیے ابنائے جامعہ سے ربط رکھنا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ انجمن اپنے تمام فلاحی ممبروں سے ربط کے لیے اور جامعہ تمام طلبۂ قدیم سے ربط کے لیے، دونوں سرگرم ہوئے۔ سراغِ کارواں کا یہ عمل اب بھی جاری ہے۔

گزشتہ سال کے مقابلہ میں آج ہم فلاحیوں سے رابطہ کے معاملہ میں بہتر حالت میں ہیں۔ اس کا اثر آئندہ انتخابات میں ظاہر ہوگا۔

اہم بات یہ ہے، جیسا کہ شروع ہی میں ذکر کیا گیا کہ تمام فلاحی ووٹروں تک پہنچنے کے سلسلہ میں نیز حلقوں کی ساخت اور تعیین کے اصول وضوابط میں متعدد تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی، جو امید ہے آئندہ کی انتخابی کمیٹی، مجلسِ شوریٰ کے مشورے اور تمام فلاحیوں سے تجاویز لے کر کرے گی۔

آخر میں برادرانہ گزارش ہے کہ کچھ اور نہ سوچیں، اگر ایسا کوئی خیال آئے تو ہماری ہدایت کے لیے دعا کریں۔(۲۳/ مارچ ۲۰۲۱ء)

....

برادر عبدالنور فلاحی کی رحلت

۱۰/ جون ۲۰۲۱ء کو برادر عبدالنور فلاحی (فضیلت ۰۱-۲۰۰۱ء) اپنے آبائی وطن دودھوانیاں بزرگ، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔ آپ ممبئی میں برسر روزگار تھے۔ رمضان المبارک میں طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ اس کے بعد الحمد للہ کافی بہتری آ گئی تھی۔ مگر ۱۰/ جون کو اچانک پھر سے طبیعت خراب ہوگئی اور اسپتال میں داخل کیا گیا، لیکن ان کا وقتِ مقرر آن پہنچا تھا اور وہ ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ برادر نیک سیرت، نیک طبیعت، خوش مزاج، باصلاحیت اور انتہائی متحرک تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے، آمین۔(عبیداللہ طاہر فلاحی)

خوشخبری

جامعہ اور وابستگانِ جامعہ کے لیے یہ نہایت خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد ارشد جمال صارم فلاحی (عالمیت ۱۹۹۸ء/ 7767993333) اور ڈاکٹر صادق علی فلاحی (عالمیت ۲۰۰۰ء/ 9368501816) کا نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور میں بحیثیتِ ریڈر تقرر عمل میں آیا ہے۔ دونوں بھائیوں کو دل کی گہرائیوں سے بہت بہت مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ اسے سب کے لیے باعثِ خیر و برکت بنائے، آمین۔(عبیداللہ طاہر فلاحی)

نئے صدرِ انجمن کو چارج منتقل

مؤرخہ ۲۶/ جون ۲۰۲۱ء کو نئے صدرِ انجمن برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی فلاحی کو سابق ذمہ دارانِ انجمن کی جانب سے چارج منتقل ہو گیا۔ بعد نمازِ عصر جامعۃ الفلاح میں انجمن کے دفتر میں چارج کی منتقلی انتہائی خوشگوار ماحول میں عمل میں آئی۔ اس موقع پر سابق صدرِ انجمن ڈاکٹر جاوید سلطان فلاحی، سابق سکریٹری انجمن عبیداللہ طاہر فلاحی اور آفس سکریٹری برادر عرفان احمد فلاحی موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے صدرِ انجمن کو نئے جوش اور نئی امنگ کے ساتھ انجمن اور جامعہ کی تعمیر و ترقی میں سرگرم ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(عبیداللہ طاہر فلاحی)

انجمن کی شوریٰ کا اجلاس اور سکریٹری وخازن اور سکریٹریٹ کا تقرر

مؤرخہ ۲۷/ جون ۲۰۲۱ء کو انجمن کی مجلسِ شوریٰ کا آن لائن اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں موجود ارکانِ شوری اور بعد میں دیگر ارکانِ شوریٰ کے مشوروں کی روشنی میں میقات ۲۰۲۱ء-۲۰۲۴ء کے لیے انجمن کے درج ذیل مرکزی ذمہ داران کا تقرر عمل میں آیا:

سکریٹری: دانش ریاض فلاحی، ممبئی

خازن: سید ابو تیمیہ فلاحی، حیدرآباد

ان کے علاوہ مختلف شعبہ جات کے تحت درج ذیل سکریٹریز کا تقرر عمل میں آیا:

۱۔ شعبہ امورِ جامعہ: عبید اللہ طاہر فلاحی، بلریا گنج

۲۔ شعبہ امورِ فارغینِ جامعہ: عبد السلام فلاحی، پٹنہ

۳۔ شعبہ اصلاح وتعمیرِ معاشرہ: صباح الدین ملک فلاحی، جامعۃ الفلاح

۴۔ شعبہ امورِ فارغینِ جامعہ (بیرونِ ملک): انعام اللہ اعظمی فلاحی، ریاض

۵۔ آفس سکریٹری: عرفان احمد فلاحی، جامعۃ الفلاح

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نومنتخب ذمہ داران کو اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (ابوالاعلیٰ سید سبحانی فلاحی، صدرِ انجمن)

آسان ترجمۂ قرآن 'مفہوم القرآن' کی تکمیل

فلاحی برادران کے لیے یہ خبر نہایت خوشی ومسرت کی ہے کہ ڈاکٹر محمد شمیم قمر فلاحی (عالمیت ۱۹۹۷ء، فضیلت ۱۹۹۹ء، 9572855009) نے آسان ترجمۂ قرآن کا کام مکمل کر لیا ہے۔ برادر نے اس کا نام ''مفہوم القرآن'' رکھا ہے۔ اس میں قرآن مجید کے لفظی اور ادبی ترجمے سے گریز کرتے ہوئے عوام الناس کے لیے آسان اور عام فہم ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

برادر نے اس کام کا آغاز نومبر ۲۰۲۰ء میں کیا تھا۔ ایک ایک پارے کا ترجمہ مکمل کر کے اس کی پی ڈی ایف گروپوں میں شیئر کرتے تھے، پورے قرآن کا ترجمہ ۱۲/ جون ۲۰۲۱ء کو مکمل ہوا، فی الحال افادۂ عام کی خاطر اس کی مکمل پی ڈی ایف فائل شیئر کی ہے جو A4 سائز کے ۶۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ برادر نے آئندہ اس میں مروجہ انگریزی اور ہندی اصطلاحوں کو بھی شامل کرنے، نیز اس ترجمے کو مزید آسان کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جلد از جلد اسے کتابی سائز میں لایا جائے، پروف ریڈنگ کا اہتمام کر کے املا اور کتابت کی غلطیوں کی اصلاح کی جائے اور بڑے پیمانے پر اس کی طباعت واشاعت کی کوشش کی جائے۔ برادر موصوف سے یہ بھی گزارش ہے کہ ایک تفصیلی مضمون لکھیں جس میں اس ترجمے کی ضرورت اور مقصد کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی خصوصیات کا تذکرہ کریں، اس پرخار راہ کی الجھنوں اور اپنی کوہ کنی کے تجربات کو سامنے لائیں، نیز اب تک جتنے آسان ترجمے منظر عام پر آئے ہیں ان کا ایک تقابلی جائزہ بھی پیش کریں۔ امید ہے عوام الناس کو قرآن مجید سے قریب کرنے کے لیے یہ آسان ترجمہ انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ (عبیداللہ طاہر فلاحی)

With best compliments from

ADHAM ALI
Managing Director

+91-9821 03 2562

Swaidan

MANPOWER CONSULTANTS

Regn. No. B0513/MUM/PER/1000+/10/8522/2009

Real Tech Park, 1013, 10th Floor, Sector 30/A
Near Vashi Railway Station, Vashi
New Mumbai-400703 (India)
Tel: +91-22-66441600, Fax: +91-22-66441688
E-mail: admin@swaidan.in
Website: www.swaidan.in

JARIDA HAYAT–E–NAU
JULY-2021

RNI No: DELURD/2015/65862
Vol. VI Issue-VII

مڈل ایسٹ میں ملازمت کے خواہش مند حضرات کے لیے
ایک قابل اعتماد ادارہ

الهند فارن سروس ایجنسی

- اگر آپ میڈیکل لائن سے متعلق ہیں
- اگر آپ کوئی ہنر جانتے ہیں
- اگر آپ صرف پڑھے لکھے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے
- اگر آپ کا کسی ہوٹل انڈسٹری سے تعلق ہے
- اگر آپ عام لیبر یا مزدور ہیں

تو آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی، فوٹو اور بائیو ڈاٹا ہمیں بھیج دیجئے......اور دیگر تفصیلات کے لیے ہماری اطلاع کا انتظار کیجئے۔

وكالة الهند للخدمات الأجنبية

AL-HIND FOREIGN SERVICE AGENCY

Registration No.: B-0376/DEL/PER/1000+/5/1263/1984

Head Off: No. 73, Main Road, Near SBI
Zakir Nagar, New Delhi-110 025 (India)
E-mail: info@al-hind.com

Ph : 0091 - 11 - 26983980, 26983981
0091 - 11 - 26988375 / 76
Fax : 0091 - 11 - 26983982

Web: www.al-hind.com

Branch Office: 38, G.F. Ashoka Shopping Complex, Near G.T. Hospital
L.T. Road, Mumbai - 400 001 (India)
Ph. : 0091-22-22652906 Fax: 0091 - 22 - 22652910